عصمت چغتائی
کی
غیر افسانوی نگارشات
ڈاکٹر محمد اشرف

عصمت چغتائی کی غیر افسانوی نگارشات

ڈاکٹر محمد اشرف

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

عصمت چغتائی
کی
غیر افسانوی نگارشات

ڈاکٹر محمد اشرف

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

عصمت چغتائی

کی

غیر افسانوی نگارشات

ڈاکٹر محمد اشرف

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ISMAT CHUGHTAI
KI
GHAIR AFSANVI NIGARISHAT

by
Dr. Mohd. Ashraf

Year of Edition 2009
ISBN 978-81-8223-538-0
Price Rs. 200/-

نام کتاب : عصمت چغتائی کی غیر افسانوی نگارشات
مصنف : ڈاکٹر محمد اشرف
سنہ اشاعت : ۲۰۰۹ء
قیمت : ۱۷۵ روپے
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

استادِ محترم **پروفیسر محمود الٰہی** صاحب

کے نام

جن سے میں نے زندگی اور ادب دونوں کا شعور حاصل کیا ہے۔

محمد اشرف

فہرست

پروفیسر احمر لاری

پیش لفظ

عصمت چغتائی ایک ہمہ گیر شخصیت کی حامل قلم کار تھیں۔ انھوں نے افسانے اور ناول (Fiction) کے ساتھ ساتھ ڈرامے، خاکے، رپورتاژ، خودنوشت سوانح، مضامین اور خطوط بھی لکھے۔ لیکن جب کسی ادیب یا شاعر کو کسی خاص صنف میں شہرت حاصل ہو جاتی ہے تو دیگر اصناف میں اس کے کارنامے عموماً نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ عصمت چغتائی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ انھیں فکشن نگاری (افسانہ و ناول نگاری) میں وہ شہرت ملی کہ دیگر اصناف میں ان کی نگارشات کی طرف، جو شائع ہو کر مقبول بھی ہوئیں، ناقدوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان اصناف پر کوئی جامع کتاب نہیں ملتی۔

ڈاکٹر محمد اشرف نے اپنی پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے اردو فکشن کی ترقی میں عصمت چغتائی کا حصہ کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا، اور اس کی اچھی پذیرائی ہوئی۔ اس سے حوصلہ پا کر انھوں نے عصمت کی دیگر اصناف کی نگارشات کی طرف توجہ مبذول کی اور انھیں اپنی تحقیق و تنقید کا موضوع بنایا۔ ان کی یہ کاوش اس کتاب کی شکل میں آپ کے پیش نظر ہے۔

یہ کتاب چھ ابواب، کتابیات اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے۔ اشرف نے ہر باب میں ایک صنف ادب کو موضوع سخن بنایا ہے۔ باب اول میں ڈراما نگاری، باب دوم میں خاکہ نگاری، باب سوم میں رپورتاژ نگاری، باب چہارم میں خودنوشت سوانح نگاری، باب پنجم میں مضمون نگاری اور باب ششم میں خطوط کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ۱۹۹۵ء میں اشرف نے عصمت چغتائی سے ایک انٹرویو لیا تھا، جو کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہے۔

اس کتاب کے لیے مواد کی فراہمی میں اشرف نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے

کام لیا ہے۔علاوہ ازیں انھوں نے دیگر اصناف کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی سعیِ مشکور کی ہے کہ یہ نگارشات بھی ان کے ناولوں اور افسانوں سے ندرتِ فکر، جرأتِ اظہار اور انفرادیتِ اسلوب میں کسی طرح کم نہیں۔انٹرویو بھی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔عصمت چغتائی نے اس انٹرویو میں اپنی حیات و شخصیت اور اپنے فکر و فن پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر محمد اشرف کی پہلی کتاب کی طرح اس کتاب کی بھی پذیرائی ہوگی۔

احمر لاری

ادبستان، رحمت نگر
ڈاک خانہ: گیتا پریس
گورکھپور۔۲۷۳۰۰۵

۲۷؍اگست ۲۰۰۸ء

حرفِ آغاز

عصمت چغتائی اردو کے افسانوی ادب کی مایۂ ناز شخصیت ہیں، جو عظیم شہرت کی مالک ہیں۔ افسانہ ہو، ناول ہو یا ڈراما اور دیگر اصنافِ ادب عصمت نے ہر میدان میں اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ بالخصوص افسانہ اور ناول میں عصمت کا اپنا جداگانہ رنگ ہے۔ عصمت ایک نڈر اور بے باک افسانہ نگار ہیں وہ سچ کی تلخی اور حقیقت کی ہولناکی سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوتیں۔ اپنے منفرد اسلوبِ بیان اور نت نئے تجربات کو بروے کار لانے کی وجہ سے ان کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ اردو فکشن کے ارتقا میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے عصمت چغتائی کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایک بڑی ہی بے باک حقیقت نگار رہی ہیں۔ اردو ادب میں وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے غیر معمولی بے باکی کے ساتھ جنسی موضوعات کو بھی اپنے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا۔ پھر بعد میں انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں جن موضوعات کو اپنایا ان کے اظہار میں انتہا درجے کی بے باکی ان کا طرۂ امتیاز رہی۔ وہ اپنی زندگی کی ہر منزل میں انقلابی افکار و خیالات کی حامی رہی ہیں، جس کا مظاہرہ انھوں نے ہر افسانے اور ناول میں کیا ہے۔

عصمت چغتائی کی تخلیقات اس امر کی غماز ہیں کہ سماج کے ہر قسم کے رستے ہوئے ناسوروں پر نوکِ قلم سے نشتر زنی کر کے معاشرے کو ان سے نجات دلانا ان کا ادبی نصب العین ہے۔ اپنے قلم کے ذریعے معاشرے میں پھیلی ہوئی ناآسودگی کی متعدد شکلوں کو جس ادبی اسلوب میں انھوں نے پیش کیا ہے یہ انھیں کا حصہ ہے۔ وہ اپنی متعدد تخلیقات کے ذریعے ایسے انسانی سماج کی تعمیر کرنا چاہتی ہیں جس میں کسی قسم کا جبر و ظلم، کسی طرح کی

گھٹن اور کسی نوع کی آلائش نہ ہو۔ عصمت نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں خواتین کی ہر سطح پر خود مختاری، سماج کے ہر طبقے کی خوشحالی، مساوات، بے تعصبی، امن و آشتی اور انسان دوستی کی تبلیغ کی ہے اور طبقاتی کشمکش، معاشی استحصال، فرقہ واریت اور جنگ وجدال کی مخالفت میں پرزور آواز بلند کی ہے۔ اس طرح ان کے افسانے اور ناول موضوعاتی نقطۂ نظر سے عظیم ہیں۔

عصمت کے پیش کردہ فکشن کے نمونے فنی اور لسانی اعتبار سے بھی انتہائی قابل قدر ہیں۔ انھوں نے اردو فکشن کو ایک نیا اسلوب دیا ہے۔ منفرد اسلوب کے ساتھ ساتھ زبان بھی عصمت نے مخصوص انداز کی اپنائی ہے۔ مفرس ومعرب اردو سے بالعموم اجتناب کر کے انھوں نے آسان اور عام فہم زبان سے کام لیا ہے، اور اس میں بیگماتی زبان، محاوروں اور کہاوتوں کی آمیزش کر کے اسے ایک انوکھا روپ دے دیا ہے۔ ان کے اسلوب بیان اور ان کی زبان انفرادی انداز کی جملہ تحریروں کا بہت بڑا وصف ہے۔ بلا شبہ ان کے افسانے اور ناول اعلیٰ ادب کے نمونے ہیں۔ اردو فکشن میں ان کے کارہائے نمایاں ناقابل فراموش ہیں۔ لہٰذا میں نے عصمت کے ان کارہائے نمایاں کو اور ان کے فکروفن کے گوشوں کو پوری طرح روشنی میں لانے کی خاطر ''اردو فکشن کے ارتقا میں عصمت چغتائی کا حصہ'' کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا۔ اس مقالے کو راقم سطور نے گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے لکھا، اور اس پر مذکورہ یونیورسٹی نے ۱۹۹۰ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ بعد ازاں یہ تحقیقی مقالہ ۱۹۹۷ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا، جسے علمی اور ادبی حلقوں نے بے حد سراہا اور اس طرح میری حوصلہ افزائی کی۔

عصمت چغتائی جیسی ہمہ جہت شخصیت نے اردو ادب کو صرف افسانے اور ناول ہی نہیں دیے بلکہ دیگر نثری اصناف میں بھی انھوں نے اہم کارنامے انجام دیے۔ ڈراما نگاری کے میدان میں جب قدم رکھا تو بارہ ڈرامے لکھے جو فنی اعتبار سے بے حد اہم ہیں جس کے عنوانات یہ ہیں ''دھانی بانکیں''۔ ''خوامخواہ''۔ ''تصویریں''۔ ''دلہن کیسی ہے''۔ ''شامت اعمال''۔ ''شیطان''۔ ''انتخاب''۔ ''سانپ''۔ ''فسادی''۔ ''بہنے''۔ ''عورت اور مرد''۔ ''دوزخ''۔ باب اول میں ان ڈراموں کا تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے۔

عصمت نے خاکے بھی تحریر کئے ہیں جو خاکہ نگاری کے میدان میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور عوام و خواص میں بے حد مقبول ہیں۔ ''دوزخی'' جو عصمت کا پہلا خاکہ ہے جس کا شمار اردو کے شاہکار خاکوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے مجاز سے متعلق کئی خاکے بھی لکھے ہیں۔ ''اسرار الحق''۔ ''عشق مجازی''۔ ''اور وہ'' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں علاوہ ازیں ''منٹو میرا دوست میرا دشمن''۔ ''خواجہ احمد عباس''۔ ''چراغ روشن ہیں''۔ ''خوابوں کا شہزادہ''۔ اور '' کچھ میری یادیں'' قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ایک خاکہ معروف شاعر و نغمہ نگار'' جاں نثار اختر'' پر بھی قلم بند کیا تھا لیکن راقم سطور کو یہ خاکہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس طرح عصمت نے کل آٹھ خاکے لکھے ہیں جن میں سے سات خاکے دستیاب ہوئے ہیں۔ باب دوم میں ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔

رپورتاژ جیسی نوزائیدہ صنف کو بھی عصمت نے اپنے فکر و فن سے جلا بخشی ہے۔ یعنی انھوں نے دو رپورتاژ بھی قلم بند کئے ہیں جو فنی خوبیوں اور زبان و بیان کے اعتبار سے اردو ادب میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ پہلا رپورتاژ ''بمبئی سے بھوپال تک'' اور دوسرا ''یہاں سے وہاں تک''۔ دونوں رپورتاژ ان کے ذاتی مشاہدات کا مظہر ہیں مذکورہ رپورتاژوں کے مختلف واقعات اور اہم نکات پر باب سوم میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

خودنوشت سوانح نگاری کے گوناگوں پہلوؤں کو عصمت نے نہ صرف اپنی مخصوص زبان دے کر اسے لازوال بنایا ہے بلکہ متعدد احوال وکوائف کو یکے بعد دیگرے بیان کر کے ایک دستاویز ہمارے روبرو پیش کیا ہے۔ عصمت نے سات خودنوشت سوانحی مضامین لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ '' کاغذی ہے پیرہن'' کے عنوان سے ان کی خودنوشت سوانح پر مبنی ایک کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔ مذکورہ کتاب اور سوانحی مضامین کا مفصل جائزہ باب چہارم میں لیا گیا ہے۔

متعدد عنوانات کے تحت مضامین بھی ان کے نوک قلم کی زینت بنے ہیں۔ جن کی تعداد نو ہے۔ یہ مضامین راقم سطور کو مختلف رسائل و جرائد اور ان کے افسانوی مجموعوں میں دستیاب ہوئے۔ باب پنجم میں ان پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

عصمت نے بے شمار خطوط بھی تحریر کئے ہیں جو ادبی اعتبار سے بے حد اہم اور

سیاسی وسماجی نقطۂ نظر سے دوررس نتائج کے حامل ہیں۔ راقم سطور کو جو خطوط مختلف رسائل و جرائد سے دستیاب ہوئے ہیں ان کی تعداد بارہ ہے۔ عصمت کے خطوط کی فراہمی کا باضابطہ کام ابھی شروع نہیں ہوا ہے اس لئے ان کے خطوط کتابی شکل میں مرتب نہیں ہیں۔ مذکورہ دستیاب خطوط پر باب ششم میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

راقم سطور نے عصمت چغتائی نے ۱۹۸۵ء میں بمبئی میں ملاقات کی تھی اور ان سے ایک انٹرویو لیا تھا۔ اس انٹرویو میں میں نے ان کی حیات اور شخصیت کے علاوہ ان کے ادبی کارناموں اور دیگر امور پر بھی گفتگو کی تھی۔ یہ انٹرویو کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہے۔

اس کتاب کی ترتیب وتالیف میں مجھے اپنے اساتذہ پروفیسر محمود الٰہی صاحب اور پروفیسر احمر لاری صاحب کی خصوصی رہنمائی حاصل رہی ہے اگر ان اساتذہ کی رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو شاید یہ کتاب اپنی موجودہ شکل میں سامنے نہ آپاتی۔ ان اساتذہ کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں۔

محمد اشرف

محلہ عسکر گنج
گورکھپور۔۲۷۳۰۰۱

۲۰ راگست ۲۰۰۸ء

باب اول

عصمت چغتائی کی ڈراما نگاری

ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے علاوہ متعدد دیگر اصناف میں بھی عصمت چغتائی نے اپنی طبع رسا کے جوہر دکھائے ہیں۔ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے ہیں اور خاکے بھی، رپورتاژ بھی سپرد قلم فرمایا ہے اور مضامین بھی تحریر کئے ہیں۔ خطوط تو ہر صاحب قلم لکھتا ہے، عصمت چغتائی کے خطوط بھی کم اہم نہیں ہے۔ اس لئے ان کی ہر اہم تحریر کا جائزہ لئے بغیر ان کی عظمت کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔

دیگر نثری اصنافِ ادب کی طرح ڈراما کی صنف بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ بقول ڈاکٹر عطیہ نشاط ''تمام اصنافِ ادب میں ڈراما ایک اہم اور زوردار صنف ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے اعلیٰ ترین نمونے ادب عالیہ میں شمار کئے جاتے ہیں (۱) ڈرامے کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمغنی فرماتے ہیں:-

''.......... ڈراما اصل میں کتاب کی چیز نہیں، اسٹیج کی ہے۔ یہ مضمون کی تحریر نہیں، تماشا سے عبارت ہے۔ لہٰذا تماشائیت اس کی رگ و پے میں ساری ہے۔ ایکٹنگ اور اس کی تمام دل ربائیوں سے ڈرامے کا تارو پود بنتا ہے۔ نقالی کے لوازم، رفتار کا ناز، گفتار کی ادا، کردار کا عشوہ، ڈرامے کے مزاج پر فیصلہ کن اثر ڈالتے ہیں۔ ڈرامے کی حرکت مستقیم اور یکسر سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتی۔ قدرتی طور پر اس میں پیچ اور کھلنڈرے پن کا ہونا ضروری ہے۔ ڈرامے کے کردار اپنی بقا کے لئے تصنع اور نمائش پر مجبور ہیں۔

دوسری اصنافِ ادب کے مقابلے میں ڈراما کی ہیئت بہت تنگ اور چست ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اختصار اور ارتکاز ہے۔ یہاں مواد کے بے شمار خوشوں کو نچوڑ کر تھوڑی مقدار میں عرق نکال لیا جاتا ہے اور اسی کو متعدد مرحلوں پر بار بار گھونٹ کر اس میں تیزابی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔ یہ ایک طرح کی دیدہ ریز کشیدہ کاری یا تنی ہوئی رسی پر کا شعبدہ انگیز رقص ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈراما نگار ایک شکنجے میں کسا ہوا رہتا ہے۔ اس کو ہمیشہ ایک حصار میں بیٹھ کر کام کرنا پڑتا ہے۔''(۲)

اردو میں ڈرامے کا باقاعدہ آغاز نواب واجد علی شاہ نے ''رادھا کنھیا'' کا قصہ لکھ

کر کیا جسے عام طور پر ''رہس'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے بعد امانت لکھنوی کا لکھا ہوا ڈراما ''اندرسبھا'' منظر عام پر آیا۔ یہ ڈراما ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا اور ۱۸۵۳ء میں اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ یہ عوام میں بے حد مقبول ہوا اور اس کی مقبولیت سے متاثر ہو کر کئی اور اندر سبھائیں لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی ڈراما نگاری کی جانب توجہ کی گئی۔ چنانچہ بنگال میں قیس کانپوری نے ''شیریں فرہاد'' کے نام سے ایک ڈراما لکھا۔ ڈھاکہ میں بھی ''غریب ہندوستان'' کے نام سے ایک ڈراما لکھا گیا۔ جس کے مصنف حکیم حبیب الرحمٰن ہیں۔ اس دور میں ڈراما نگاری کو سب سے زیادہ فروغ بمبئی میں حاصل ہوا۔ بمبئی میں کئی تھریٹیکل کمپنیاں قائم ہوئیں، کلب کھولے گئے اور منڈلیاں بھی بنیں۔ جن میں ڈراما کھیلنے کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا، اس زمانہ میں منظوم ڈراما کا زیادہ رواج تھا۔ ڈراموں کے بیچ بیچ میں اشعار کی پیش کش سے اس کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔ ڈراما نگاری کے اس انداز کو بمبئی کے عوام بے حد پسند کرتے تھے۔ بمبئی کے ڈراما نگاروں میں رونق بنارسی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے بہت سے ڈرامے تخلیق کیے۔ اردو ڈراما نگاری کے ارتقاء میں طالب بنارسی کی خدمات بھی قابل قدر ہیں۔ انھوں نے بھی کافی تعداد میں ڈرامے لکھے۔ طالب بنارسی شاعر بھی تھے اور ڈراما نگار بھی۔ انھوں نے ڈرامے کے فن کو بہت آگے بڑھایا۔ ان کے ڈراموں میں زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ مزاحیہ عنصر بھی شامل رہتا تھا—

منشی جوالا پرشاد برق، مولانا شرر لکھنوی، رسوا لکھنوی اور ظفر علی خاں نے بھی ڈراما نگاری کے ارتقا میں خاطر خواہ حصہ لیا ہے۔ اردو ڈراما نگاری کے ارتقاء میں اور جن دیگر فنکاروں نے حصہ لیا ان میں احسن لکھنوی، بیتاب دہلوی اور آغا حشر کاشمیری کے نام بڑی اہمیت رکھتے ہیں ان سب میں آغا حشر کاشمیری کو خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ سید بادشاہ حسین حیدر آبادی اس ضمن میں رقم طراز ہیں۔ ''آغا حشر کاشمیری طرز قدیم کے ممتاز ڈراما نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں'' (۳) بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی:-

> ''آغا حشر کو اگر اردو کا شیکسپئیر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ انھوں نے دیگر ڈراما نگاروں کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں ڈرامے لکھے ہیں۔
> انھوں نے اردو ڈراما نگاری کے دامن کو وسیع کیا، اور اس کے فن کو

بلند کیا۔ ان کے ڈراموں میں زورِ بیان اور جدتِ خیال کی خوبیاں
قدم قدم پر ملتی ہیں۔ آغا حشر کے ڈراموں کے پلاٹ بھی بہت اہمیت
رکھتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے سنجیدہ مسائل کو اپنے ڈراموں میں
جگہ دی ہے۔ آغا حشر کے ڈرامے واضح طور پر اس امر کا اعلان
کرتے ہیں کہ اب ڈراما نگاری کا نیا زمانہ آرہا ہے۔'' (۴)

آغا حشر کشمیری کے بعد جن ڈراما نگاروں نے اس صنف کی ترقی و ترویج میں نمایاں حصہ لیا ان میں امتیاز علی تاج، سعادت حسن منٹو خواجہ احمد عباس، خواجہ حسن نظامی، کشن پرشاد کول، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، قاضی عبدالغفار، نیاز فتحپوری، اثر لکھنوی، علی عباس حسینی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

عصمت چغتائی نے افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے ساتھ ہی ساتھ ڈراما نگاری میں خاصی دلچسپی لی ہے۔ عشرت رحمانی لکھتے ہیں۔ ''عصمت چغتائی مشہور طنز نگار اور مقبول افسانہ نویس ہیں۔ اردو کی صاحب طرز ادیبہ ہونے کے ساتھ ڈراما کے فن میں ان کو خاص دلچسپی اور مہارت حاصل ہے۔ انھوں نے نشریات کے تقاضوں کو سمجھ کر کئی ڈرامے لکھے۔ جو شہرت اور مقبولیت کے مالک ہوئے۔ ریڈیو کے علاوہ مختصر ایکانکی ناٹک بھی لکھے۔'' (۵)

عصمت چغتائی نے تقریباً ایک درجن ڈرامے تخلیق کیے جو شائع ہو کر عوام و خواص میں داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا پہلا ڈراما ''دھانی بانکیں'' ہے۔ یہ ڈراما عصمت چغتائی نے ۱۹۴۷ء کے ہندو مسلم فساد کے خونچکاں مناظر کے پس منظر میں تخلیق کیا ہے۔ یہ ڈراما ہمیں اس وقت کی یاد دلاتا ہے جب ہندوستان غیر ملکی سامراج سے آزاد ہوا۔ آزادی ملتے ہی ہندوستانی باشندے جو آپسی اخوت کے تار میں بندھے ہوئے تھے ایک دوسرے کے حریف بن کر سامنے آگئے۔ پھر جو فسادات کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے نہ جانے کتنے گھروں کے چراغ گل کر دیے۔

اس المیہ کو عصمت چغتائی نے جس طرح سے پیش کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے۔ ہندوستان کے ایک بڑے شہر میں دو دوست برج نرائن اور حامد علی ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی بیویاں روپا اور عائشہ اور ان کے دونوں بچے سورج اور خورشید اس طرح آپس میں

گھل مل کر زندگی کے شب و روز گزار رہے ہیں جیسے لگتا ہے سب ایک ہی خاندان کے فرد ہیں۔ ۱۹۳۷ء کا زمانہ ہے۔ ایک روز ایک منہارن گھر میں داخل ہوتی ہے۔ اور اپنی چوڑیوں کا گٹھر کھول کر بیٹھ جاتی ہے اور دھانی بانکیں نکال کر دکھاتے ہوئے ضد کرتی ہے کہ یہ دھانی بانکیں بڑی عمدہ ہیں اسے پہن لو ٹھیک اسی وقت برج اور حامد دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ منہارن انھیں دفتر جانے سے منع کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے۔

''منہارن—اے بیٹا آج تو نہ جاتے تو اچھا تھا۔ برج— کیوں؟ کیا پھر چاقو تو چلوا ئے تم نے منہارن—اے نوج میں خاک پڑی کا ہے کو چلواتی اے وہ آپ ہی چل رہے ہیں۔ چھتے میں آج صبیرے صبیرے تین خون ہوئے ہیں۔'' (۶)

لیکن دونوں ہی یعنی برج اور حامد اپنے اپنے کام پر جاتے ہیں اور کچھ دیر بعد ان کی لاشیں خون میں نہائی ہوئی آتی ہیں۔ دونوں عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں۔ اب دونوں عورتیں اپنے اپنے بچوں کے سہارے اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی ہیں۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے زندگی کے دس برس گزر جاتے ہیں۔ بچے جو اس وقت چھوٹے چھوٹے تھے اب جوان ہو جاتے ہیں۔ برج کے لڑکے سورج کی شادی بھی ہو گئی ہے۔ اس کے چمن میں پھول بھی کھلنے والا ہے۔ ۱۹۴۷ء کا زمانہ ہے۔ ایک روز پھر وہی منہارن ''دھانی بانکیں'' لے کر آتی ہے اور کہتی ہے کہ

''..........اے لو بہو کہاں ہے۔ کیا ''دھانی بانکیں'' لائی ہوں کہ

بس—اور

دھانی بانکیں کے نام سے روپا کے ہاتھ لرزنے لگتے ہیں اور عائشہ کے چہرے پر وہی پاگلوں جیسی وحشت طاری ہو جاتی ہے دونوں سناٹے میں دیکھتی ہیں۔'' (۷)

حالانکہ اس واقعہ کو گزرے ہوئے دس سال بیت چکے ہیں، لیکن منہارن کے آنے سے دونوں عورتوں کے لئے واقعہ پھر تازہ ہو جاتا ہے۔ ان کے لڑکے سورج اور خورشید کام پر جا رہے ہیں، آج بھی منہارن انھیں بتاتی ہے کہ شہر میں قتل و خون اور غارتگری مچی ہوئی ہے۔ جگہ جگہ ہندو مسلم فساد ہوئے ہیں۔ فضا اچھی نہیں ہے۔ یہ سب سن کر روپا اور

عائشہ دونوں ہی میں اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دونوں کا خیال یہ ہے کہ منہارن جلد از جلد بہو کو دھانی بانکیں پہنا کر چلتی بنے ورنہ اس کی باتوں سے وحشت میں اور اضافہ ہوگا۔ منہارن جب بہو کے ہاتھ میں دھانی بانکیں ڈالتی ہے تو کئی چوڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ جسے وہ بدشگونی سے تعبیر کرتی ہے۔ جس کے تحت دل میں طرح طرح کے خدشات جنم لینے لگتے ہیں۔ شام کو جلد ہی واپس آنے کا وعدہ کر کے دونوں دفتر چلے جاتے ہیں لیکن شام کو واپس نہیں آپاتے ہیں۔ کرفیو کی وجہ سے وہیں رُک جاتے ہیں۔ گھر میں سبھی افراد فکر مند ہوتے ہیں، رات ہو جاتی ہے۔ طرح طرح کے اندیشوں سے ان کے دل بیٹھنے لگتے ہیں۔ جب رات کافی ہو چکتی ہے تو عائشہ، روپا اور لکشمی کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ نیند میں سب برے برے خواب دیکھتی ہیں۔ لکشمی خواب میں دیکھتی ہے کہ بلوائی اس کی طرف بڑھ رہے ہیں اور وہ بڑبڑا اٹھتی ہے۔

"......خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا...... میں گربھوتی ہوں (غرور سے تن کر) گربھوتی دیوی ہوتی ہے۔ دیوی کا اپمان نہ کرنا۔ اگر تم نے میرے خون کی ایک بوند بھی دھرتی کے سینے پر ٹپکائی تو سدا کے لئے بانجھ ہو جائے گی۔ میرا خون پی کر مٹی اناج اگلنا چھوڑ دے گی۔ میرے خون کے دھبے تمہارے ہاتھوں دھوئے نہ چھوٹیں گے۔ میں نئی دنیا کو جنم دینے والی ہوں! میں نئی آشا کی ماں ہوں۔ اگر تم نے مجھے مار دیا تو تمہارا ناس ہو جائے گا۔ دنیا جنم جنم تک تمہارے صورتوں پر پھٹکار بھیجے گی۔ تمہارا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔ دور ہو جاؤ...... تمہاری تلواریں میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتیں۔ تمہارے خنجر میری طرف نہیں اٹھ سکتے۔ میں نئی دنیا کو جنم دوں گی (چہرے پر اطمینان اور سکون چھا جاتا ہے)...... میری ننھی منی دنیا، پریم اور شانتی کا سندیسہ سارے جگ میں پھیلائے گی (بلندیوں کی طرف امید اور شوق سے دیکھتی ہے) یہ کالے بادل چھٹ جائیں گے نیا سورج جنم لے کر دنیا کو جگمگا دے گا۔ (جذبات کی فراوانی سے آواز گھٹ جاتی ہے اور

آنسو بہنے لگتے ہیں (آپس کی کھوٹ مٹ جائے گی...... بھائی بھائی
مل جائیں گے ۔۔۔ پرکاش!!۔''(۸)

''دھانی بانکیں'' کا شمار اُردو کے چند اچھے ڈراموں میں کیا جاسکتا ہے۔اس میں مقصدیت کے ساتھ اثر آفرینی بھی ہے۔ممتاز حسین لکھتے ہیں کہ'' .... ''دھانی بانکیں'' اپنے مقصد اور اثر کے لحاظ سے ایک غیر معمولی ڈرامہ معلوم ہوتا ہے۔''(۹)

ناول اور افسانہ تو عصمت کا اوڑھنا بچھونا تھا۔لیکن جب ہم ''دھانی بانکیں'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس بات کے اظہار میں کسی طرح کی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی کہ عصمت کو صنفِ ڈراما پر بھی وہی دسترس حاصل ہے جو دیگر نثری اصناف میں ہے۔مجموعی اعتبار سے موضوع اور فن کے لحاظ سے یہ ایک کامیاب ڈراما ہے، جس میں اچھے اور عمدہ مکالمے قلم بند کئے گئے ہیں۔زبان و بیان پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

عصمت کے ڈراموں کا ایک مجموعہ ''شیطان'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس میں کل چھ ڈرامے شامل ہیں۔جن کے عنوانات یہ ہیں ''شیطان''۔''خوامخواہ''۔۔۔ تصویریں''۔۔۔دلہن کیسی ہے''۔''شامت اعمال'' اور ''دھانی بانکیں'' الگ سے کتابی صورت میں اسی نام سے شائع ہو چکا ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔باقی پانچ ڈرامے نئے ہیں۔

''شیطان'' ایک دلچسپ ڈراما ہے۔اس میں کل چار کردار ہیں سجاد، روشن، احمد اور صوفیہ۔سجاد ایک روشن خیال اور ترقی پسند ذہن کا مالک ہے۔روشن اس کی بیوی ہے۔ جو کم سخن اور زود رنج قسم کی عورت ہے۔احمد، سجاد کا بچپن کا دوست ہے۔احمد ایک علم دوست اور خاموش طبع انسان ہے۔گو کہ سجاد اور احمد کے مزاج میں زمین اور آسمان کا فرق ہے لیکن پھر بھی دونوں کی دوستی قائم رہتی ہے۔اس ڈرامے میں عصمت چغتائی نے انسان کی حد سے زیادہ آزاد خیالی سے پیدا نتائج کی طرف بڑے لطیف اور دلچسپ انداز میں اشارے کئے ہیں۔سجاد اپنی آزاد طبع اور روشن خیالی کے سبب اپنے ہی ہاتھ اپنے گھر میں آگ لگا بیٹھتا ہے اور اپنی بیوی کو چھوڑ کر اپنے دوست کی بیوی میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں میاں بیوی کے تعلقات میں دراڑ پیدا ہو جاتی ہے۔وقت بے وقت تکرار ہوتی ہے۔آخر ایک روز اس کی بیوی روشن اس کے اس نازیبا رویے سے تنگ آکر احمد کی بیوی صوفیہ سے

پوچھ گچھ کی خاطر اس کے گھر جاتی ہے۔ گھر میں صرف احمد ملتا ہے۔ دونوں میں دیر تک بحث وتکرار ہوتی ہے۔ لیکن احمد خود کو بے قصور اور قابل رحم ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اپنی لچھے دار باتوں سے روشن کا دل جیت لیتا ہے۔ روشن اپنے شوہر سے بدظن ہوتی ہے اور وہ اسی وقت سجاد سے طلاق لینے کے لئے خط لکھ ڈالتی ہے۔ احمد بھی اپنی بیوی صوفیہ کو طلاق نامہ لکھ بھیجتا ہے اور جب دونوں کو یعنی سجاد اور صوفیہ کو اپنے اپنے شوہر اور بیوی کی طرف سے طلاق نامے موصول ہوتے ہیں تو دونوں کو شدید دھچکا لگتا ہے۔ کیونکہ وہ یہ نہیں جانتے تھے۔ وہ تو صرف اپنی آزاد خیالی اور روشن خیالی کی وجہ سے عشق ومحبت کے مزے لے رہے تھے۔ خط پاتے ہی سجاد احمد کے گھر پہنچتا ہے اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد صوفیہ بھی اپنے گھر پہنچتی ہے۔ بڑی دیر تک آپس میں بحث وتکرار ہوتی ہے اور ہر ایک اپنی اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ بالآخر سبھی اپنی غلطی پر نادم ہوتے ہیں۔ سجاد روشن کو لے کر گھر آجاتا ہے۔ احمد اور صوفیہ کے درمیان جو کدورت رہتی ہے وہ بھی دور ہو جاتی ہے۔ سب اپنی پچھلی زندگی کو بھول کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ اس محور پر پہنچ کر ڈراما کا اختتام ہوتا ہے۔

ڈراما ''خوامخواہ'' کالج کی زندگی پر مبنی ہے۔ جس میں انھوں نے کالج کی زندگی کو بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس ڈراما میں تین کردار ہیں۔ رفیق، محمود اور طاہرہ—— رفیق ایک ذہین اور خوددار طالب علم ہے۔ اسے لڑکیوں سے نفرت ہے۔ محمود رفیق کا دوست ہے۔ طاہرہ کالج کی سب سے تیز طرار طالبہ ہے۔ کالج کے لڑکے اسے بہت عزیز رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں ان میں حسد اور جلن کا جذبہ ضرور ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ طاہرہ بھی رفیق سے جلتی ہے۔ محمود دونوں کی فطرت اور عادات واطوار سے بخوبی واقف ہے۔ وہ ان دونوں کو مزا چکھانے کے ارادہ سے دونوں کو بے وقوف بناتا ہے۔ پہلے رفیق سے ملتا ہے اور اسے خوب شیشے میں اتارتا ہے۔ طاہرہ کی تعریفیں کرتا ہے، اور اسے بتاتا ہے کہ طاہرہ اسے دل سے پسند کرتی ہے۔ بے التفاتی ایک دکھاوا ہے تاکہ لوگ اس کے راز سے واقف نہ ہونے پائیں۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ وہ تمہاری عقل مندی اور خودداری سے بہت متاثر ہے۔

اس کے دل میں تمہاری بے حد عزت ہے۔وہ تمہیں ایک باکمال انسان سمجھتی ہے۔اسے تمہاری یہی ادا بہت پسند ہے کہ تم دوسرے لڑکوں کی طرح لڑکیوں کی خوشامد نہیں کرتے پھرتے۔وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ایک روز مجھ سے منت کررہی تھی کہ کسی روز رفیق سے ملوادیجئے،آپ کا احسان ہوگا۔اس طرح رفیق کو طاہرہ سے ملنے پر آمادہ کرلیتا ہے اور ملاقات کے لئے اتوار کا دن طے کرتا ہے اور پھر طاہرہ کے پاس پہنچتا ہے اور اسے بھی شیشے میں اتارتا ہے۔وہ اسے بتاتا ہے کہ رفیق تم سے عشق کرتا ہے۔وہ تمہیں بہت چاہتا ہے۔تمہاری خوبیوں کا بے حد مداح ہے۔اس کی شرافت،تہذیب اور شائستگی دیکھو کہ تمہیں چاہتے ہوئے بھی کبھی اس نے اس کا اظہار نہیں کیا،اور نہ ہی کبھی تمہارے پیچھے لگا۔اس نے ایک نظم بھی لکھی ہے۔جس میں تمہاری بڑی تعریف کی ہے۔وہ آئی طاہرہ وہ نور برساتی ہوئی آئی۔وہ تو اتفاق سے میری نظر سے گزری اور میں اس کے دل کا راز جان سکا،ورنہ وہ کبھی اس کا اظہار نہ کرتا اور اس طرح وہ طاہرہ کو بھی رفیق سے ملنے کے لئے راضی کرلیتا ہے اور اتوار کو ملنے کا وعدہ لے کر واپس آجاتا ہے۔

اتوار کے روز دونوں یعنی طاہرہ اور رفیق ایک دوسرے سے بڑے چاؤ سے ملتے ہیں۔آپس میں لگاوٹ کی باتیں کرتے ہیں۔ایک دوسرے کے خلوص اور محبت کے ممنون ہوتے ہیں۔ایک دوسرے کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔دونوں ایک دوسرے سے شکوہ کرتے ہیں کہ اب تک ہم کیوں نہ ملے؟ یہ محمود صاحب کا احسان ہے کہ انھوں نے ہمیں ملنے کا موقع فراہم کیا۔دونوں اس کے احسان مند ہوتے ہیں کہ اگر وہ نہ ملواتے تو دونوں ایک دوسرے سے کبھی نہ مل پاتے وہ بڑے کام کا آدمی ہے۔لیکن بات جب آگے بڑھتی ہے تو دونوں پر آشکار ہوجاتا ہے کہ محمود نے بڑی ہی چالاکی کے ساتھ دونوں کو بے وقوف بنایا ہے۔

''خوانخواہ'' جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے۔کالج کی سطح کی داستانِ محبت ہے۔جس میں اکثر لڑکے اور لڑکیاں بلاارادہ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوجاتے ہیں اور ان پر یہ راز بعد میں منکشف ہوتا ہے کہ خوانخواہ انھوں نے اپنا قیمتی وقت ضائع کیا۔اس ڈراما میں ایسے ہی واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔گویا عصمت نے اس ڈراما میں کالج کے لڑکے اور لڑکیوں کو متنبہ کیا ہے کہ کالج پڑھنے کی جگہ ہے اور تعلیم میں مصروف رہنا ہی تمہاری ترقی کا ضامن ہے۔خوانخواہ

کسی اور مشغلہ میں مصروف رہ کر اپنا وقت ضائع کرنا سراسر خلاف عقل بات ہے۔

''تصویریں'' میں عصمت چغتائی نے خواب کیا ہوتے ہیں اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔اس ڈراما کی ابتدا میں اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھتی ہیں:

''ہم سوتے جاگتے کتنے خواب دیکھتے ہیں۔ کچھ تو ایسے بے تکے اور بے ہنگم جن کا سر نہ پیر، کچھ ہمارے دماغ کے عجیب و غریب وا ہمے مختلف صورتوں میں سوتے میں ہمارے اوپر حملہ آور ہوتے ہیں۔ یہی معمولی باتیں جو ہم جاگتے میں سوچتے ہیں بھیس بدل کر خوف زدہ کردیتی ہیں۔نفسیات کے پروفیسر کہتے ہیں۔''خواب دبی ہوئی خواہشات اور غیر محسوس خوف کا نتیجہ ہیں۔''جن چیزوں سے ہم جاگتے میں فرار چاہتے ہیں سوتے میں ہمارے قابو سے نکل کر ہمارے اوپر قابض ہو جاتی ہیں اور ہماری قلعی کھول دیتی ہیں''۔(۱)

عصمت نے اپنے اس نظریے کو سعید، نیلوفر اور شمیم تین کرداروں کی مدد سے اس ڈرامے میں پیش کیا ہے۔لڑکیوں سے عشق کرنا، آنکھیں لڑانا، فقرے کسنا اور بے باکی کا مظاہرہ کرنا سعید کی فطرت ثانیہ ہے۔

''سعید — لڑکیوں سے محبت لڑانا بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتا ہے مگر اس کا Subconcious لڑکیوں سے خوف زدہ ہے۔ جتنا جاگتے میں چرب زبان اتنا ہی سوتے میں بدحواس۔

نیلوفر — سعید کا ہمزاد — جاگتے ہوئے سعید کی طرح چرب زبان اور بے باک''(۱۱)

شمیم کا مزاج سعید کے برعکس ہے۔وہ عشق وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتا بس صرف سعید کی باتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔شمیم کا تعارف کراتے ہوئے عصمت لکھتی ہیں

''شمیم — جس کا مقصدِ زندگی عشق کرنا نہیں۔اس کے متعلق چٹخارے دار تجربات سننا ہے۔''(۱۲)

ڈراما سعید کے کمرے سے شروع ہوتا ہے۔سعید کا کمرہ پرانی وضع کا مگر اعلیٰ قسم

کے فرنیچروں سے مزین ہے۔ کمرے کی دیواروں پر عورتوں کی ننگی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ صبح کے نو بجے ہیں۔ سعید اپنے کمرے میں سو رہا ہے اس کا دوست شمیم آجاتا ہے اور وہ شمیم کی دستک کے ساتھ اٹھ بیٹھتا ہے اور شکایتی انداز میں یہ کہتے ہوئے دروازہ کھولتا ہے کہ لوگ اتوار کے روز بھی سونے نہیں دیتے۔ پھر دونوں دوستوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگتی ہیں۔ باتوں باتوں میں سعید کی نوکری کی بات چل نکلتی ہے۔ شمیم کہتا ہے کہ یار تمہارے تو مزے ہیں۔ وہ سعید کی قسمت پر رشک کرتا ہے۔ نوکری کے ساتھ ساتھ تمہیں ایک عدد بیوی بھی ملنے والی ہے۔ فرم کا مالک تمہیں گھر داماد دینے والا ہے اور پھر سعید کی ہونے والی بیوی کی بات چل نکلتی ہے۔ جس کا نام وہ نیلوفر بتاتا ہے۔ شمیم ایک ایک بات مزے لے لے کر پوچھتا ہے اور سعید خوب چٹخارے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ اس نے کس طرح نیلوفر کو شیشے میں اتارا ہے اس کے حسن، اس کے لباس، اس کی چال ڈھال ہی نہیں بلکہ اس کے ایک ایک عضو کی تعریف بڑے ہی رومانٹک انداز میں کرتا ہے۔ نیلوفر کے حُسن کی تعریف کرتے ہوئے سعید کہتا ہے:

> ''............ اُف! وہ سرد کو لبھانے والا لچکیلا قد، کافوری بلاؤز میں سے صنوبر کی صندلی شاخوں کی طرح حسین لہراتی ہوئی بانہیں۔ آسمانی زرتار ساڑی جس پر مشاق کاری گرنے جیسے روپہلی ستاروں کو پگھلا کر لکیریں کھینچ دی ہوں۔ کانوں میں لمبے لمبے آویزے جیسے شبنم کے مسلسل قطرے سورج کی کرن میں پرو کر لٹکا دیے ہوں بات کرتے میں وہ آویزے کچھ اس طرح کپکپا اٹھتے جیسے کسی کنواری کا مقدس آنسو۔''(۱۳)

شمیم بڑے انہاک سے اور توجہ کے ساتھ سنتا ہے اور اس کی قسمت پہ رشک کرتا ہے۔ پھر شمیم نیچے کے ہوٹل سے ناشتہ لینے چلا جاتا ہے۔ شمیم کے جاتے ہی سعید پھر سو جاتا ہے اور سوتے میں خواب دیکھتا ہے کہ نیلوفر آتی ہے، نیلوفر کو دیکھتے ہی وہ بدحواس ہو جاتا ہے۔ نیلوفر بات کرنا چاہتی ہے تو وہ اس کی کسی بات کا جواب نہیں دے پاتا ہے۔ وہ اپنے حُسن و شباب کی طرف اس کی توجہ مبذول کرانا چاہتی ہے اور اپنے لباس وغیرہ کا رنگ پوچھتی ہے۔ لیکن گھبراہٹ کی وجہ سے سعید کچھ نہیں بتا پاتا۔ وہ پسینے میں شرابور ہو جاتا ہے۔ نیلوفر اس کا

مضحکہ اڑاتی ہے اور کہتی ہے کہ آپ تو میرے عاشق ہیں مجھے گلے سے لگا لیجئے، میرے جلتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیجئے اور وہ یہ کہتے ہوئے سعید کی جانب قدم بڑھاتی ہے کہ آؤ میرے باپ کے اکلوتے داماد — اتنے میں شمیم مع ناشتہ کے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور سعید کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ سعید کی حالت دیکھ کر شمیم سمجھ جاتا ہے کہ آج اس نے پھر ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ سعید کی حالت بگڑتی ہی جاتی ہے۔ اس پر بالکل دیوانگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ شمیم کو مارنے دوڑتا ہے۔ شمیم آہستہ سے باہر کھسک جاتا ہے۔ سعید کو ایسا لگتا ہے کہ سارا کمرہ گھوم رہا ہے اور کمرے کی ساری تصویریں اس پر ہنس رہی ہیں وہ پلنگ پر گر کر سسکیاں لینے لگتا ہے۔

''دلہن کیسی ہے'' عصمت کا ایک انتہائی دلچسپ ڈراما ہے۔ یوں تو اس میں متعدد کردار ہیں۔ چھمی خالہ، شفیق، حمیدہ اور حمیدہ کی ماں یہ سارے کردار دلچسپی کے سامان سے لیس ہیں۔ لیکن اس ڈراما میں چھمی خالہ کا کردار دوسرے کرداروں کے مقابلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ چھمی خالہ کا اندازِ گفتگو بڑا نرالا ہے اور ان کی طرز ادا بالکل فطری انداز لئے ہوئے ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر خالہ نظر آتی ہیں۔ چھمی خالہ کا تعارف کراتے ہوئے عصمت لکھتی ہیں: ''چھمی خالہ — ایک مکمل خالہ'' ہیں اور حمیدہ کے متعلق لکھتی ہیں کہ ''حمیدہ بے چین اور بے صبر بھانجی ہے'' ڈراما انہیں دونوں کرداروں کے گرد و پیش گھومتا رہتا ہے۔

قصہ یوں ہے کہ چھمی خالہ شفیق کے لئے دلہن دیکھنے گئی ہوئی ہیں۔ حمیدہ بڑی بے چینی اور بے صبری سے ان کی منتظر ہے۔ وہ جلد از جلد یہ جاننا چاہتی ہے کہ دلہن یعنی اس کی ہونے والی بھابی کیسی ہے۔ اس نے شفیق کو بھی اس لئے روک رکھا ہے کہ خالہ آجائیں تو وہ کہیں جائے۔ خالہ کے آتے ہی حمیدہ ان سے سوالات شروع کر دیتی ہے کہ خالہ بی کیسی ہے دلہن؟ لیکن چھمی خالہ اس کی بات کو نظر انداز کر کے گرمی کی سختی کا رونا رونے لگتی ہیں۔ حمیدہ پھر پوچھتی ہے کہ ''گوری ہے نا خالہ''۔ لیکن خالہ پر کچھ عجیب کیفیت طاری ہے وہ حمیدہ کے سوال کا درست جواب نہ دے کر گرمی اور پیاس کی شکایت کو لے کر گفتگو چھیڑ دیتی ہیں۔ پھر نائین کا ذکر چھڑتا ہے تو اس کا شکوہ لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ حمیدہ اس طرح کی گفتگو

سے چڑھ جاتی ہے اور شکوہ کرتی ہے کہ آپ کون سی بات لے کر بیٹھ گئی ہیں۔ پھر اپنا سوال دہراتی ہے کہ دلہن کیسی ہے، لیکن خالہ اسے ڈانٹ کر کہ درمیان میں بات نہ کاٹا کرو دوبارہ نائین کی گفتگو پر آجاتی ہیں۔

شفیق کو بھی دیر ہورہی ہے۔ وہ حمیدہ کو آواز دیتا ہے۔ حمیدہ جاتی ہے اور ذرا دیر رکنے کے لئے کہہ کر لوٹ آتی ہے اور پھر خالہ سے پوچھتی ہے کہ ہماری بھابی کیسی ہے؟ خالہ بی پھر بگڑتی ہیں۔ تو دیوانی ہوگئی ہے کیا؟ اب وہ راستے کی خرابی، چلچلاتی دھوپ کی سختی اور سندو کہار کا شکوہ لے کر بیٹھ جاتی ہیں اور بڑی تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ ادھر حمیدہ اتاولی ہورہی ہے۔ وہ پان مانگتی ہیں۔ پھر کیا تھا پان کے ذکر کے ساتھ ساتھ سمدھن کے ہاں پان کھانے کی بات چل نکلتی ہے اور طول پکڑ لیتی ہے۔ شفیق پھر چلاتا ہے۔ حمیدہ آتی ہے اور کہتی ہے کہ نہ جانے کس کمبخت نائینوں کا ذکر کررہی ہیں۔ بس آپ ذرا دیر اور ٹھہر جائے۔ اتنے میں اماں پوچھ بیٹھتی ہیں کہ صرف گرمی ہی کو پیٹے جاؤ گی کہ کچھ بتاؤ گی بھی کہ وہاں تمہاری کچھ خاطر وغیرہ بھی ہوئی کہ نہیں اور پھر وہ وہاں کے کھانے پینے کے لوازمات کے ذکر شروع کردیتی ہیں اور گھنٹوں وہی بیان کئے جاتی ہیں ادھر حمیدہ کڑھتی رہتی ہے اور شفیق کو بھی دیر ہورہی ہوتی ہے۔ حمیدہ بگڑ کر کہتی ہے کہ گھنٹہ بھر ہوگیا ایک بات بھی دلہن کی نہیں بتاتی ہیں۔ سارا دن انتظار میں مرتے رہے۔ اس کی اماں بھی کہتی ہیں کہ ہاں بھئی بتا بھی چکو کہ دلہن کیسی ہے؟ لیکن وہ خرمیوں وغیرہ کا ذکر شروع کردیتی ہیں۔ آخر حمیدہ کے ضبط کا پارہ نہ رہا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکل پڑتا ہے کہ آگ لگے ان خرمیوں کو ہاں نہیں تو'' اس پر خالہ بی خفا ہوجاتی ہیں اور بغیر کچھ بتائے اٹھ کر یہ کہتے ہوئے چل پڑتی ہیں:

''.........سلام آپا تمہارے گھر میں قدم بھی رکھوں تو جھی نہیں بھنگن کہنا۔ ابھی تو باتیں سنی ہیں آگے نہ جانے کیا لکھا ہے۔''(۱۴)

حمیدہ کی ماں روکتی ہی رہ جاتی ہیں مگر وہ نہیں رکتیں اور دلہن کیسی ہے آخر تک پتہ نہیں چل پاتا۔ حمیدہ رونے لگتی ہے تو اس کی ماں اسے تسلی دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ''.......ہم کل خود جاکر دیکھ آئیں گے کہ کیسی ہے دلہن۔''(۱۵)

''دلہن کیسی ہے'' ایک اوسط درجہ کا ڈراما ہے جس میں ڈرامائیت کے عناصر موجود

ہیں۔ آج کے سماج میں اب بھی ایسے کردار موجود ہیں جو بے تکان ادھر اُدھر کی باتیں تو کرتے ہیں لیکن حرف مطلب زبان پر آنا ان کے لئے ایک بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ اس طرح کے کردار کے ساتھ عصمت کا یہ ڈراما تکمیل پاتا ہے اور تجسس آخری وقت تک برقرار رہتا ہے۔

''شامت اعمال'' عصمت چغتائی کا بڑا دلچسپ ڈراما ہے۔ اس میں کئی کردار ہیں مثلاً سرور (عباس کی بیوی) عباس، بندو (نوکر)، ایڈیٹر، خاتون، شاعر، بڑھیا (بندو کی نانی)، شرابی، انور (عباس کا دوست) اور انسپکٹر۔ اس ڈراما کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

عباس کو ایک کھویا ہوا بٹوہ ملتا ہے۔ اس کی شامت اعمال یہ ہوتی ہے کہ وہ اخبار میں اس کا اشتہار دے دیتا ہے کہ جس کا بٹوہ ہو آ کر لے جائے۔ بس پھر کیا تھا۔ لوگ جوق در جوق بھاگے چلے آ رہے ہیں، اور سبھی لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ بٹوہ میرا ہے۔ لیکن جب عباس ثبوت مانگتا ہے تو سبھی لاجواب ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اس کی بیوی بٹوے کی دعوے دار بن بیٹھتی ہے اور عباس سے بٹوہ طلب کرتے ہوئے کہتی ہے:

''سرور:- پھر ٹالے جاتے ہیں۔ بھئی اللہ۔ لاؤ بھی سیدھی طرح۔

عباس:- کچھ دماغ خراب ہوا ہے۔ کیا ٹالے جا رہا ہوں؟ کیا لاؤں؟

سرور:- میں کہتی ہوں چھوڑو یہ دل لگی۔ دھوبن کی تنخواہ دینی ہے۔ آتی ہوگی ابھی جان کھانے — لاؤ ادھر بٹوہ

عباس:- یہ کیسے معلوم کہ وہ بٹوہ تمہارا ہے؟

سرور:- اور کس کا ہے پھر؟

عباس:- بٹوہ کا مالک خود ثبوت دے گا۔

سرور:- کیا مطلب؟

عباس:- مطلب یہ کہ میں نے اخباروں میں اشتہار دے دیا ہے کہ جس کا بٹوہ کھویا ہو وہ آ کر حلیہ بتائے اور اپنا بٹوہ لے جائے۔'' (۱۶)

عباس کو اپنے اس اقدام کی ایسی سزا ملتی ہے کہ وہ عاجز آ جاتا ہے، کیونکہ بہت سارے لوگوں کا ایک مجمع اس کے دروازے کے سامنے بلائے ناگہانی کی طرح آ موجود

ہوتا ہے اور کبھی خود کو بٹوہ کا مالک بتاتے ہیں۔ مجبوراً عباس کو اپنی مدد کے لئے پولس بلانی پڑتی ہے۔ پولس آتی ہے اور کہتی ہے کہ کہاں ہے بٹوہ؟ اور عباس بٹوہ پولس انسپکٹر کے حوالے کر دیتا ہے۔ انسپکٹر ہاتھ میں بٹوہ لیتے وقت پوچھتا ہے کہ اس میں کیا ہے۔ جواتنی آفت مچی ہے۔ عباس کہتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم، میں نے اسے کھول کر دیکھا بھی نہیں ہے کہ اتنے میں ایک بڑھیا بتانے لگتی ہے:

''بڑھیا: - اے میاں کچھ بھی نہیں۔ پانچ پیسے نقد، چھالیہ کے چار دانے، تمباخو اور ایک ٹوٹی ہوئی بالی کی گونج

انسپکٹر: - ہیں! تمہیں کیسے معلوم بڑی بی۔

میرا ہی اللہ ماری کا ہے۔ لال چھینٹ کا بٹوہ۔

عباس: - ہیں!

بڑھیا: - پرسوں بیوی جی دعوت میں گئی تھیں تو میں بھی گئی تھی شاید موٹر میں گر گیا تھا۔

عباس: - تو کمبخت بڑھیا — تو نے جب سے نہ کہا۔

بڑھیا: - اے میاں۔ تم سنتے بھی ہو۔ کئی دفعہ کہنے آئی مگر تم ایسا چیخ پڑے کہ میں چپ ہوگئی۔ بیوی جی سے کہنے لگی سو وہ بھی بے سنے ڈانٹنے لگیں۔

عباس: - توبہ توبہ

سرور: - آگ لگے موئے بٹوہ کو۔'' (۱۷)

کچھ کردار دنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو سادہ لوحی کے سبب مات کھاتے ہیں اور پھر کف افسوس ملتے ہیں۔ لیکن سادہ لوحی کی وجہ سے ایسا کام انجام دیتے ہیں جو ان کی خود کی مصیبت کا باعث بن جاتا ہے۔ عصمت نے اس ڈراما میں عباس کے کردار کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج دنیا میں انسان کے نیک جذبے کی کوئی قدر نہیں ہوتی، اسلئے اسے پریشانیوں میں مبتلا ہو جانا پڑتا ہے۔

''انتخاب'' عصمت چغتائی کا بہترین ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں کل چار کردار ہیں۔ خالہ بی، شمیم، واجد اور عالم۔ کرداروں کا تعارف کراتے ہوئے عصمت لکھتی ہیں۔

''خالہ بی: چالیس پینتالیس سال کی امیر بیوہ، بھاری بھرکم، اپنی عمر سے زیادہ جوان اور

خوبصورت نظر آتی ہیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے بُردباری اور غرور ٹپکتا ہے۔ کنپٹیوں پر ہلکے ہلکے سفید بالوں کی جھلک پیدا ہوگئی ہے۔ چھوٹے سے دہانے میں اگلے تین مصنوعی دانت کسی طرح اصلی بتیسی سے کم خوبصورت نہیں۔ چال میں ایک دبدبہ ہے اور تمکنت ہے۔

شمیم: خالہ بی کی بھانجی۔ خالص ہندوستانی رنگ اور معمولی نقشے کا مجموعہ۔ سیدھی سادھی بچی۔ خالہ بی کے دباؤ میں رہنے والی کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔ لوگ کہتے ہیں اس کا معدہ خراب رہتا ہے۔ اس لئے اس قدر چڑچڑی اور کھسیائی ہوئی رہتی ہے۔ اللہ جانے!

واجد: شمیم سے سال ڈیڑھ سال بڑا بھائی۔ سیدھا سادا۔ جلد باز

عالم: واجد کا بچپن کا دوست ہمسن اور ہم جماعت ذرا قد لمبا ہے۔ لیکن ذرا ڈیلا اور کرخت ساخت کا بنا ہوا جسم، ناک نقشہ بالکل عام انسانوں جیسا۔ بہت بے تکلف، گویا اپنے ہی گھر میں رہتا ہے"(۱۸)

عالم اور واجد ایک دوسرے کے جگری دوست ہیں۔ بچپن ہی سے دونوں کا ایک دوسرے سے ساتھ ہے اور آج بھی دونوں کی دوستی قائم ہے۔ تینوں اب جوان ہو چکے ہیں لیکن عالم اب بھی واجد کے گھر میں بلا تکلف اور بے روک ٹوک آیا جایا کرتا ہے۔ عالم کا اس طرح گھر میں آنا خالہ بی کو ناگوار گزرتا ہے۔ وہ منع کرتی ہیں۔ شمیم کو بھی تنبیہہ کرتی ہیں کہ تم اب جوان ہو چکی ہو۔ تمہارا اس طرح بے پردہ عالم کے سامنے آنا مناسب نہیں۔ شمیم عالم سے ملنے جلنے سے پرہیز بھی کرتی ہے۔ ایک روز گھر میں صرف شمیم ہی اکیلی رہتی ہے کہ عالم آجاتا ہے اور واجد کے متعلق اس سے دریافت کرتا ہے۔ شمیم اسے بتاتی ہے کہ واجد میچ دیکھنے گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتی ہے کہ یہاں سے تم جاؤ۔ اسی اثنا میں واجد آجاتا ہے۔ یہ جان کر کہ شمیم عالم کو گھر سے بھگا رہی ہے تو شمیم پر خفا ہوتا ہے کہ آخر عالم گھر میں کیوں نہ آئے؟ اس پر شمیم واجد کو خالہ بی کی تنبیہہ یاد دلاتی ہے، لیکن واجد عالم کے گھر آنے پر خوشی کا اظہار کرتا ہے اور اس سلسلہ میں کسی پابندی کو قبول نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خالہ بی کی تنبیہہ کو نظر انداز کر دیتا ہے اور عالم کا آنا جانا بدستور قائم رہتا ہے۔ ایک روز خالہ بی کی موجودگی

میں عالم آتا ہے اور سیدھے شمیم کے کمرے کی طرف یہ کہتے ہوئے چلا جاتا ہے:

عالم: ''ذرا کتابیں ہیں۔ شمیم کے کمرے میں بھول گیا تھا۔ اس دن''—اور خالہ بی کو بے حد ناگوار گزرتا ہے۔ وہ .... غصہ اور نفرت سے اسے جاتا دیکھتی ہیں اور زور سے چھالیہ کترتی ہیں۔ ہلکی سی رقابت اور نفرت کی ملی جلی جھلک سی چہرے پر نظر آتی ہے۔ ڈلی کا ایک بڑا سا ٹکڑا ایک پُر معنی کھٹا کے سے کاٹتی ہیں۔ گویا وہ مارا دشمن کو۔'' (۱۹)

ایک روز شمیم کو ایک رقعہ ملتا ہے جسے پہلے تو وہ پھاڑ ڈالتی ہے، لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس کے ٹکڑوں کو جوڑ کر پڑھتی ہے۔ اتنے میں واجد کے آنے کی آہٹ ہوتی ہے اور وہ ان ٹکڑوں کو دری کے نیچے چھپا دیتی ہے۔ واجد کے آنے پر شمیم ان مسلے ہوئے ٹکڑوں کو اس کے حوالے کر دیتی ہے، جن کو ملا کر واجد پڑھتا ہے۔ خط عالم کا ہوتا ہے۔ واجد بے حد خفا ہوتا ہے اس کے دل میں عالم کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور واجد خالہ بی کو بغیر بتائے اپنے گھر جانے کی تیاری شروع کر دیتا ہے۔ اسی اثنا میں عالم بھی آ جاتا ہے وہ اس کی تیاریوں کو دیکھ کر پوچھنا چاہتا ہے، مگر واجد اور شمیم دونوں ہی غصے میں بھرے ہیں۔ عالم لاکھ گڑگڑاتا ہے، مگر اس کی ایک نہیں سنتے اور دونوں واجد اور شمیم اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ عالم پریشان سا وہیں کھڑا رہ جاتا ہے۔ گویا کسی نے اسے کچل دیا ہو۔

خالہ بی اپنے کمرے سے نکلتی ہیں اور عالم سے کچھ سوال کرتی ہیں، لیکن وہ ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیتا، چپ چاپ کاغذ کے ٹکڑوں کو جیب میں رکھتا ہے اور چل دیتا ہے۔

اس ڈراما میں نفرت و محبت کے جذبات کی عصمت نے اچھی منظر کشی کی ہے۔ بوڑھی عورتوں کی قدم قدم پر رخنہ اندازی نے اس ڈراما کو قدیم و جدید تہذیب کا سنگم بنا دیا ہے۔

''سانپ'' میں کئی کردار ہیں۔ سید رفیعہ، خالدہ، غفار اور ظفر۔ سید اور رفیعہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ غفار رفیعہ کا منگیتر ہے۔ دونوں کی منگنی بچپن ہی میں بزرگوں نے کر دی ہے اور غفار رفیعہ کو اپنی بیوی اور رفیعہ کے گھر کو اپنی سسرال سمجھتا ہے۔ خالدہ سید کی منگیتر ہے۔ ظفر سید کا دوست ہے۔

یوں تو سبھی نئی تہذیب اور نئی روشنی کے پروردہ ہونے کے باعث آزاد خیال ہیں، لیکن ان میں سید صاحب سے زیادہ آزاد خیال کوئی نظر نہیں آتا ہے۔ اسے فرسودہ روایتوں سے چڑھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب والد کے انتقال پر رفیعہ سید کے کوٹ میں کالی پٹی ٹانکنا چاہتی ہے تو وہ خفا ہوتا ہے اور سختی سے منع کرتے ہوئے کہتا ہے: ''.......... کیا دنیا میں ہمیں ڈگی پٹینی ہے کہ بھئی ہمارے باپ کا انتقال ہو گیا ہے، جس کا ہمیں بہت ہی صدمہ ہے۔'' (۲۰)

سید ان لوگوں سے بھی بدظن ہے اور برا بھلا کہتا ہے، جو لوگ پُرسہ دینے آتے ہیں اور بار بار اپنے غم کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب رفیعہ کا منگیتر غفار آتا ہے اور اپنے غم کا اظہار ان لفظوں میں کرتا ہے: ''.......... اُف! کس قدر اداسی چھائی ہوئی ہے۔'' تو سید خفا ہوتے ہوئے کہتا ہے: ''.......... معاف کرنا —— غفار یہی بالکل یہی جملہ تم صبح دہرا چکے ہو۔''(۲۱) اور غفار سٹپٹا جاتا ہے۔

سید اور رفیعہ دونوں بھائی بہن ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے حد درجہ بے تکلف اور بے باک ہیں۔ دونوں آزادانہ طور پر ایک دوسرے کی منگنی اور شادی بیاہ کے متعلق باتیں کرتے رہتے ہیں، اور آپس میں ہمہ وقت لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ ان کی آزاد خیالی اور بے تکلفی کا اندازہ دونوں کی درج ذیل گفتگو سے لگایا جا سکتا ہے:

سید : چپ رہو۔ تو اب تم اسے خط نہ لکھنا——

رفیعہ: کیوں؟ واہ!

سید : نہیں—— آخر فائدہ—— تم اس سے شادی تو کر نہیں رہی ہو۔

رفیعہ: کیا معلوم—— قسمت کی کسی کو کیا خبر؟ فرض کرو غفار مجھ سے شادی نہ کرے اور جیسے کہ تم کہتے ہو۔ ظفر میرے اوپر تھوکے بھی نہیں۔ تو پھر یہ .... ٹھیک رہے گا .... روپیہ بہت ہے۔

سید : (غصہ سے بھنا کر) کمبخت چپ رہ اور پھر کہتی ہے، تجھے کچھ نہ کہوں۔

رفیعہ: آخر کیوں؟ میں کوئی کیا ہوں——

سید : اور پھر پوچھتی ہو ''کیا کرتی ہوں''۔ یہ تم اتنا کیوں اتراتی ہو!

رفیعہ: کون، میں اتراتی ہوں؟

سید : ہاں اور خصوصاً غفار کو دیکھ کر۔

رفیعہ: ذرا...... (جل کر) اچھا جاؤ اتراتے ہیں۔ پھر تمہارا کیا، تم کیوں جلے مرتے ہو!

سید : مجھے غفار پر ترس آتا ہے۔

رفیعہ: اوہو، بڑا ترس آتا ہے جیسے اسے کوئی کھائے ہی تو جارہا ہے۔

سید : کھائے ہی جارہا ہے اور نہیں تو پھر کیا۔" (۲۲)

"سانپ" عصمت کا ایک ایسا ڈراما ہے جس میں مغربی تہذیب اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے، اور مشرقی روایات کو فرسودگی کا نام دیا گیا ہے۔ اس ڈراما کا نام "سانپ" علامتی ہے۔

"فسادی" عصمت چغتائی کا بڑا دلچسپ ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں یوں تو کئی کردار ہیں جیسے عزت، نشاط، ایاز، الماس، جولی، حورا، محمود اور اماں جان۔ لیکن جن کرداروں کو اس ڈراما میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ محض دو ہیں یعنی عزت اور نشاط، پورا ڈراما انہیں دونوں کے گرد گھومتا ہے۔ نشاط عزت کے منگیتر یعنی ہونے والے شوہر ایاز کا چھوٹا بھائی ہے جو ہمہ وقت اپنی طرح طرح کی حرکتوں سے عزت کو تنگ کیا کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ عزت سے کہتا ہے: "........ ارے ہم خوب جانتے ہیں وہ خود تم سے نفرت کرتے ہیں۔ اجی وہ کیا تم پر مرتے ہیں، وہ تو چچی جان کا دل رکھنے کو مجبوراً انھیں قبولیں ہی قبولیں۔ مرتا کیا نہ کرتا ورنہ ان کی تو کالج میں مس پر بھا کر سے بہت ہی...... اور عزت یہ کہہ کر خاموش ہو رہتی ہے: "تو یہاں کون مرتا ہے ان کے لئے۔ ان کی مس پر بھا کر ہوں یا کوئی ہوں۔" (۲۳)

اس طرح ایک روز عزت اپنے کمرے میں لیٹی پڑھ رہی ہوتی ہے کہ نشاط پیچھے سے داخل ہوتا ہے اور بلب بجھا دیتا ہے۔ غرض یہ کہ برابر دونوں کے درمیان ہنسی مذاق ہوتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی جب نشاط کی شرارت حد سے زیادہ گزر جاتی ہے تو دونوں میں خفگی بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن نشاط عزت کو چھیڑنے سے کبھی باز نہیں آتا اور اس طرح روز کی چھیڑ چھاڑ سے دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت کے جذبات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ عزت بیماری کی وجہ سے اپنے کمرے میں لیٹی ہے اور نشاط یہ کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتا ہے: "........ ارے تو کیوں اس قدر ٹھونس جاتی ہو۔ جو مرنے لگتی

ہو۔'' (۲۴) اور آگے جو کچھ ہوتا ہے درج ذیل اقتباس میں ملاحظہ فرمائیں۔

''نشاط: (پلنگ پر اس طرح بیٹھ جاتا ہے کہ ایک ہاتھ عزت کے اوپر سے لے جا کر دوسری طرف پلنگ کی پٹی پر رکھے ہے) بہت گال پھول چکے تھے (ہلکے سے نوچتا ہے) میں کہتا ہوں کہ اب تو مجھ سے چوگنے ہیں۔

عزت: دیکھو میں اٹھ کر چلی جاؤں گی اگر تم نے مجھے دق کیا۔ (اٹھنا چاہتی ہے)

نشاط: (نہیں اٹھنے دیتا) اور جھک کر گال پر پیار کرتا ہے۔ خاموشی سے اس کے رخسار پر رخسار رکھ دیتا ہے) عزت۔ میری عزت۔ عزت! (عزت کچھ مسحور سی آنکھیں پھاڑ کے خلا میں گھور رہی ہے)

(نشاط عزت کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کے ہونٹ چوم لیتا ہے) عزت کانپنے لگتی ہے۔'' (۲۵)

ڈراما ''فسادی'' ایک گھر کی پوری زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جہاں جذبات نگاری پورے شباب کے ساتھ موجود ہے۔ جذبات میں انسان کس طرح اپنے وجود کو فراموش کر دیتا ہے۔ ''فسادی'' اس کی اچھی مثال ہے۔

''ننّے'' عصمت چغتائی کا ایک شاندار ڈراما ہے۔ جس کا مرکزی کردار ننّے ہے۔ ننّے ایک نٹ کھٹ، شریر اور فسادی نوجوان ہے۔ وہ اپنی چلبلی حرکتوں سے زہرہ کو بار بار تنگ کرتا ہے۔ کبھی اس کے کمرے میں جا کر ساری چیزیں الٹ پلٹ دیتا ہے، کبھی اس کا البم دیکھتا ہے، کبھی اس کی کاپیوں سے ورق پھاڑ دیتا ہے، کبھی اس کے صابن سے منہ دھونے لگتا ہے، کبھی صراحی سے پانی پیتا ہے۔ زہرہ جب بہت زیادہ پریشان ہو جاتی ہے تو آلہ بی سے شکایت کرتی ہے۔ وہ الٹے زہرہ کو ہی ڈانٹتے ہوئے کہتی ہیں: ''اوئی! ذرا تمہاری صراحی میں سے پانی پی لیتا ہے تو بس مر گئیں۔'' (۲۶) عصمت نے ننّے کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

''ایک تندرست خوش طبع، خودسر، خودرائے اور منہ پھٹ، پھوہڑ اور لڑاکا — بلا کا ذہین اور پڑھنے کا شوقین۔ بزرگوں کی باتوں میں پٹاپٹ بولنے والا۔ مگر آلہ بی کی نظروں میں گھی کا لڈو۔'' (۲۷)

اور اس طرح ننّے اور زہرہ میں برابر تکرار ہوتی رہتی ہے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ

زہرہ بنے کا کمرہ صاف کر رہی ہوتی ہے کہ بنے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔اور کہتا ہے ''......پکڑی گئیں نہ آج ارے جبھی میں کہوں یہ میری چیزیں کون اڑا لے جاتا ہے۔کل میری ساری شکر کوئی کھا گیا۔میں سمجھا چوہے ہیں اور آج پتہ چلا کہ جناب ہیں...... دو ٹانگوں کی چوہیا۔

زہرہ: ہوش میں رہنا___ایک تو میں کمرہ صاف کرنے آئی اور......

بنے: یہ ایک دو تو مجھ سے نہ چلے گی___اونہک۔سیدھی طرح میری چیزیں لائیں۔

زہرہ: بھاڑ میں جائیں تمہاری چیزیں۔میں کیا جانوں۔

بنے: بھاڑ میں جا خود___لو صاحب ایک تو چیزیں غائب اوپر سے غرآنا۔مگر یہ تو بتاؤ جب میں نے تمہیں منع کر دیا ہے کہ خبردار میرے کمرے میں قدم نہ رکھنا ورنہ ٹانگیں توڑ دی جائیں گی تو......

زہرہ: چُپ بدتمیز بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔آئے وہاں سے ٹانگیں توڑنے والے میں کیوں آتی___ آل بی نے بھیجا کہ ذرا کمرہ صاف کر لو۔مہمان آ رہے ہیں۔''(۲۸)

اور دیر تک دونوں میں نوک جھونک جاری رہتی ہے۔مہمان ایک ڈپٹی صاحب ہیں جو زہرہ کو پسند کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔وہ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔بنے اس رشتے کو ہونے نہیں دیتا۔وہ ڈپٹی صاحب سے کہتا ہے:

''بنے: میری بہن بہت بدمزاج اور لڑاکا ہے،اسے ذراسی بات کی برداشت نہیں ہوتی۔ آپ سے اب کیوں چھپایا جائے۔ذرا ذرا سی بات پر رو دیتی ہے۔

ڈپٹی صاحب: مجھے ان کے خلاف کبھی کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہوگی۔دوسرے وہ اگر دو باتیں بیجا کہیں گی تو میں برداشت کرلوں گا___

بنے: معاف کیجئے گا ڈپٹی صاحب آپ اس وقت ذرا رومینٹک ہو رہے ہیں ذرا غور کیجئے اپنی اچھی خاصی زندگی میں کیوں کانٹے بو رہے ہیں۔گھر کا سکون عنقا ہو جائے گا۔چھوڑیئے اس بیہودہ خیال کو۔آپ کو شرائط بھی معلوم ہیں حق طلاق اور پچھتر ہزار مہر۔

ڈپٹی صاحب: جی مجھے سب منظور ہے۔

بنے: کیا آپ کو یہ بھی خیال آیا ہے کہ کہاں سے آپ اتنا مہر لائیں گے اور جب طلاق ہی دینا ہے تو شادی ہی کیوں کر رہے ہیں۔

ڈپٹی صاحب: (نوالہ سے کھیلتے ہوئے) میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

بنے: یوں لیجئے۔۔۔اب فرض کیجئے شادی کے چوتھے روز زہرہ آپ کو طلاق دیدے اور مہر کا دعویٰ کر دے تو؟

ڈپٹی صاحب: (سٹپٹا کر) جی آخر، آخر بے وجہ کیوں؟

بنے: بے وجہ کیوں۔اس کی شادی اس کی مرضی سے نہیں کی جائے گی۔لہٰذا وہ یہی وجہ بتا سکتی ہے کہ چونکہ بزرگوں نے زبردستی کی تھی لہٰذا اب میں دوسری کرنا چاہتی ہوں۔

ڈپٹی صاحب: لاحول ولاقوۃ۔۔یہ کہیں شریف گھرانوں میں ہوا کرتا ہے۔'' (۲۹)

اس طرح ڈپٹی صاحب اور زہرہ کی شادی رُک جاتی ہے۔دراصل اس میں راز یہ ہے کہ ڈپٹی صاحب معمر شخص ہیں وہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔بنے کو یہ بات کسی طرح گوارا نہیں ہوتی۔اسی لئے وہ ڈپٹی صاحب سے کچھ ایسی باتیں کہہ جاتا ہے کہ وہ بھڑک اٹھتے ہیں اور زہرہ کو ان کی بیوی بننے سے نجات مل جاتی ہے۔بعد میں وہ خود ہی زہرہ کو اپنی شریک حیات بنالیتا ہے۔اس ڈراما میں بھی عصمت نے انسانی جذبات نگاری کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔

''عورت اور مرد'' عصمت چغتائی کا انتہائی دلچسپ اور کامیاب ڈراما ہے۔اس میں انھوں نے ان سفید پوش قوم پرستوں، مصلحت اندیشوں اور عزت دار لوگوں کو ہدف ملامت بنایا ہے، جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا ہے۔وہ کام میں اپنی مصلحت کو اولیت دیتے ہیں۔

قصہ یوں ہے کہ زبیدہ جو اس ڈراما کی ہیروئن ہے۔اپنے ہم جماعت رشید سے عشق کرتی ہے۔رشید بھی اس کو دل وجان سے چاہتا ہے۔وہ زبیدہ سے شادی کر کے اسے اپنی بیوی بھی بنانے کا آرزومند ہے۔لیکن رشید ایک غریب ماں باپ کا لڑکا ہے۔اس لئے زبیدہ کے والد جو ایک ریٹائرڈ جج ہیں اور جن کو ''سر'' کا خطاب بھی ملا ہوا ہے۔شہر کے رؤسا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ایم۔پی کا الکشن بھی لڑنے والے ہیں۔وہ رشید کو اپنا داماد بنانے

میں اپنی بے عزتی محسوس کرتے ہیں۔زبیدہ رشید کو پسند تو کرتی ہے لیکن وہ ایک ڈرپوک لڑکی ہے۔اس کے اندر گھر،خاندان اور سماج سے بغاوت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔اس لئے وہ رشید سے معذرت کے ساتھ کہتی ہے کہ مجھے بھول جاؤ،میں مجبور ہوں۔رشید بھی اس کی مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے ضبط سے کام لیتا ہے اور خاموش ہو رہتا ہے۔لیکن جب اس کے دوست محمود کو پتہ لگتا ہے تو وہ رشید کو سمجھاتا ہے کہ تم نرے الّو ہو۔اس کو زبردستی قابو میں لے آؤ اور اسے لے کر شہر سے بھاگ جاؤ۔لیکن ایک تو رشید کم ہمت نوجوان ہے دوسرے اسے زبیدہ اور اس کے خاندان کی عزت کا خیال بھی ہے۔اس لئے وہ ایسا کرنے سے گریز کرتا ہے۔محمود کہتا ہے کہ ٹھیک ہے تم اسے نہ اپناؤ نہ سہی میں اس سے شادی کر کے دکھاتا ہوں۔وہ دعویٰ کرتا ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر اسے اپنی بیوی نہ بنایا تو میرا نام محمود نہیں۔چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔دوسرے ہی روز زبیدہ اور محمود کی ملاقات ریلوے اسٹیشن پر ہو جاتی ہے،اور اتفاق سے جس کمپارٹمنٹ میں محمود بیٹھتا ہے،اس میں زبیدہ بھی داخل ہو جاتی ہے۔حالانکہ زبیدہ کو کلکتہ جانا ہے،لیکن محمود اپنی چالاکی سے اسے اپنے ہمراہ الہ آباد چلنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے اور اسے زبردستی لے جاتا ہے دوسرے روز ااخبار میں یہ خبر پڑھی جاتی ہے کہ محمود اور زبیدہ ازدواجی رشتے میں بندھ گئے۔اس خبر کو جب زبیدہ کے والد پڑھتے ہیں تو سر پیٹ لیتے ہیں اور جب زبیدہ اپنے گھر پہنچتی ہے تو وہ آپے سے باہر نظر آتے ہیں،یہاں تک کہ وہ اسے گولی مار دینے پر آمادہ ہیں۔اس واقعہ نے دنیاوی اعتبار سے انھیں کہیں کا نہ رکھا،وہ ساکھ جو بڑی ریاضت کے بعد ان کو ملی تھی پل بھر میں جاتی رہی۔اس لئے وہ کچھ بھی کر گزرنے کے لئے تیار تھے۔مگر جب زبیدہ کے چچا نیاز صاحب انھیں سمجھاتے ہیں اور جان لیوا اقدامات سے انھیں باز رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تو آپ کے لئے فالِ نیک ثابت ہو سکتا ہے۔آپ کا نام روشن ہو سکتا ہے،بہتر ہے آپ زبیدہ کی شادی محمود سے کر دیں،میں اخبار میں آج ہی اس خبر کو چھپوادوں گا۔"لوگ کہیں گے اتنے بڑے رئیس ہیں مگر دیکھو ایک معمولی لڑکے کو ہونہار دیکھ کر لڑکی دے دی اور تمام شہروں میں دھوم مچ جائے گی آج ہی اخباروں میں نکلوادوں گا کہ قوم کے حامی فخر الاسلام سر ہدایت علی کی فیاضی۔"(۳۰)اور یکا یک سر ہدایت علی کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔وہ زبیدہ کی گستاخیوں کو معاف کرنے اور محمود کے ساتھ اس کا بیاہ

کرنے کے لئے بخوشی رضامند ہو جاتے ہیں۔ اب ان کی ناک کٹنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ وہ مصلحت کے آگے سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب زبیدہ کے چچا نیاز صاحب اسے سمجھاتے ہیں کہ بیٹی جانے دو جو ہو رہا ہے سب اچھا ہی ہو رہا ہے۔ اس میں مصلحت ہے تو وہ چڑھ کر کہتی ہے اچھی مصلحت ہے، آپ لوگوں کی، حالانکہ زبیدہ محمود کے ساتھ شادی کرنے پر کسی بھی قیمت پر رضامند نہیں ہوتی، لیکن اس کے والد اس بات پر مصر ہیں کہ بیٹی کی شادی کر ڈالنے میں ہی ہم سب کی بھلائی ہے اور وہ محمود کو ٹیلی فون کر کے بلا لیتے ہیں اور باقی انتظامات کے لئے نیاز صاحب کو فرمان جاری کر دیتے ہیں اور نیاز صاحب بھی سب کچھ اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں آپ فکر نہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس ڈراما کا بنیادی پہلو جھوٹی شان و شوکت ہے۔ جسے عصمت نے بڑی چابکدستی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ مصلحت پسندی کے شکار افراد کے لئے مصلحت پسندی ہی سرمایۂ حیات ہوتی ہے۔ اس میں ان کا ظاہر اور باطن پوری طرح گم رہتا ہے۔

''دوزخ'' عصمت چغتائی کا دلچسپ اور دل کو چھو لینے والا ڈراما ہے۔ یوں تو اس ڈراما میں کئی کردار ہیں، لیکن اس کے مرکزی کرداروں میں دو بوڑھی عورتیں ہیں۔ یعنی نولاسی خانم اور عمدہ خانم۔ انھیں دونوں کرداروں کے گرد و پیش ڈراما گھومتا رہتا ہے۔ عصمت نے ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

''دو لاوارث ٹھیائی ہوئی بڑھیاں جن کا دنیا میں کوئی نہیں۔ محلے والوں کے رحم و کرم پر پلتی ہیں۔ دونوں میں کبھی گاڑھی چھنتی ہے کبھی جوتا چلتا ہے۔ دنیا کی مسرتوں سے دور یہ نامراد بڑھیاں ایک دوسرے کا جیجا بھی چاٹا کرتی ہیں اور ایک دوسرے کا سہارا بھی ہے۔''(۳۱)

انھیں دو کرداروں کے ذریعے عصمت نے اس ڈراما میں دلچسپی کا خزانہ بھر دیا ہے۔ انھوں نے ان کی بات چیت، عادات و اطوار، مزاج اور اندازِ گفتگو وغیرہ کو اس سلیقے سے پیش کیا ہے کہ وہ جب آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں، یا آپس میں میل محبت کی باتیں کرتی ہیں، یا ایک دوسرے کو کوسنے دیتی ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ہم کوئی ڈراما نہیں پڑھ رہے ہیں، بلکہ

سچ مچ ہمارے سامنے دو بڑھیاں بیٹھی آپس میں گفتگو کر رہی ہیں یا برسر پیکار ہیں مثلاً درج ذیل اقتباس میں ان دونوں کی نوک جھونک ملاحظہ ہو:

''نولاسی: اے بوا بس بڑی سناتی رہو۔ ہاں بھئی جوانی کی نیند جو ہوئی بوڑھے منہ مہاسے لوگ چلے تماشے۔ شرم بھی نہیں آتی کیا جوانوں کی طرح پھیل پھیل سوا جاوے ہے۔ (تمھی پھر آن دھمکتی ہے جل کر حملہ کرتی ہیں) ہیضہ سمیٹے — پیاروں پٹی۔

عمدہ: (کوسنا اپنے لئے سمجھ کر خوفزدہ ہوکر ہڑبڑا کر اٹھتی ہیں) ہیضہ سمیٹے تمھیں۔ تمہارے ہوتے سوتوں کو —

نولاسی: (معصومیت) سے اُوئی جروا جامے سے باہر ہوئی جاتی ہو۔

عمدہ: منہ بھر بھر کے کوس رہی ہو اور اوپر سے تیہہ دکھاتی ہو —

نولاسی: اے واہ بوا! جوتیوں سمیت دیدوں میں گھسی چلی آتی ہو — میں نے تمہیں کب کوسا! میں تو موئی مکھی کی جان کو پیٹ رہی تھی، کب سے جان کو لگی ہے۔ کیا مجال جو گھڑی بھر کو چین لینے دے۔''(۳۲)

پھر جب عمدہ خانم اپنی بھانجی کے گھر جانے لگتی ہیں تو اس گھر کو اور نولاسی خانم کو بڑی حسرت سے دیکھتی ہیں۔ انھیں اس گھر کو چھوڑ کر جانے اور نولاسی خانم سے جدا ہونے کا بڑا ملال ہے۔ ساتھ ہی نولاسی خانم بھی رنجیدہ نظر آتی ہیں۔ انھیں بھی اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ اب عمدہ خانم ان سے جدا ہو جائیں گی۔ اس کا اندازہ اس وقت دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے لگایا جا سکتا ہے۔

''نولاسی: (اداس آنکھیں بڑی حسرت سے اٹھا کر) عمدہ خانم کہا سنا معاف کرنا بہن —

عمدہ: (بل جاتی ہیں مگر بناوٹی سختی لہجہ میں لا کر) خماخاں کو میرے سر آرہی ہو۔ میں کسی کا بیر کلیجے میں نہیں پالتی۔

نولاسی: (لجاجت سے) نہیں بُوا، تم کیا مجھ نصیبوں جلی سے بیر پالوگی —

عمدہ: (سامان باندھتے ہاتھ رک جاتے ہیں — پھر ٹال جاتی ہیں)

نولاسی: کیڑے پڑیں اس موئی زبان میں، قابو ہی میں نہیں رہوے ہے۔

عمدہ: (ترس آتا ہے) نہیں بوا، تم پھر چکی ہو۔ اللہ ماری اس زبان کے پیچھے اللہ بخشے!

اماں چار چوٹ کی مار دیا کریں تھیں۔اس جنم جلی زبان کے پیچھے بڑے بھیا سے چھٹم چھٹا ہوئی—مرتے مرتے صورت نہ دکھائی—

نولاسی: (نہ جانے کہاں کھوئی ہوئی ہیں—خاموش آنسو بہتے ہیں)

عمدہ: جذبات پر قابو پانے کے لئے بناوٹی غصہ سے) اُوئی! اب یہ ٹسوے کا ہے کو بہائے جارہے ہیں۔

نولاسی: میں نے تمہیں بہت جلایا عمدہ خانم—تمہارا ہی پتہ تھا جو سہار گئیں—کوئی اور سری کی ہوتی تو منہ میں جھلسا لگا دیتی۔کچھ بھی ہو، بوا! تم دل کی بری نہیں—

عمدہ: اے لو اور سنو دل کا برا کون ہووے ہے۔دو برتن ساتھ رہویں ہیں تو کھڑکا ہووے ہی ہے۔''(۳۳)

عصمت کو فرسودہ سماج کے آپریشن کا ملکہ حاصل ہے۔اس ڈراما میں کوئی ایسی بات نہیں پیش کی گئی ہے جو اپنی جگہ انفرادی ہو۔لیکن عصمت نے جس حقیقت نگاری کے ساتھ اسے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ مکمل فنکاری ہے۔

ناول اور افسانہ عصمت کا خاص موضوع ہے۔ان اصناف پر انھوں نے اپنا زور قلم صرف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔صنف ڈراما بھی ایک دلچسپ صنف ہے جس پر عصمت نے سماج میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات کو ترتیب دے کر قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

ڈراما وہ صنف ہے جس پر لکھنے کے لئے بڑے مشاہدے کی ضرورت پڑتی ہے۔ عصمت کے یہاں قوت مشاہدہ اور حقیقت بیانی دو ایسے وصف ہیں جو قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ڈراما سے عصمت نے نہ صرف نشرواشاعت کا کام لیا ہے، بلکہ اس کے معیار کو انگریزی ڈراما کے معیار تک پہنچانے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب نظر آتی ہیں۔

☆☆

باب دوم

عصمت چغتائی کی خاکہ نگاری

خاکہ نگاری جدید اردو نثر کی اہم صنف ہے۔ دیگر اصنافِ ادب کی طرح اس میں بھی اسالیب کے تنوع اور فن کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ ان سے پہلے کہ خاکہ نگاری پر تفصیل بحث کی جائے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ناقدینِ فن کی آرا کو یکجا کیا جائے تا کہ اس صنف کے معائب و محاسن کا ایک اجمالی جائزہ سامنے آجائے۔ اس صنف کے متعلق ڈاکٹر صابرہ سعید لکھتی ہیں: ''اس میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ ایک پھول کے مضمون میں تمام گلشن کی روح بند کی جاسکتی ہے۔ خاکہ میں زندگی کے ہر پہلو کو سمو لینے کی بڑی صلاحیت ہے۔''(۱) خاکہ میں مصنف کسی خاص شخص کی سیرت و صورت، گفتار و کردار، عادات واطوار کو دل کش انداز میں بیان کرتا ہے۔ محمد حسنین کی رائے میں '' .... ہماری نظریں یہاں کسی خاص فرد سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ اس شخص کا چہرہ، چہرے کے نقوش اور اس کی شخصیت کے چند دل کش جلوے ادیب کی اس قلمی تصویر سے ہمارے پیش نگاہ آجاتے ہیں۔ اس صنفِ ادب میں ایک عجیب و پُر فریب ہستی مقید ہوتی ہے، جسے دیکھنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اسے جانتے تو تھے۔ اچھے خاکہ کی کامیابی کسی ''نامور شخصیت'' سے شرف نیاز کی مسرت ہے۔''(۲)

اردو ادب میں یوں تو خاکہ نگاری کی ابتدا انیسویں صدی کے اواخر ہی میں ہو چکی تھی، لیکن اس کا باقاعدہ آغاز اور ارتقا بیسویں صدی میں ہوا۔ اردو خاکہ نگاری کے اولین نمونے محمد حسین آزاد کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا، خواجہ حسن نظامی کی تحریریں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ لیکن یہ نقوش مدھم ہیں۔ اردو ادب کے پہلے اور بھرپور خاکہ نگار مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں۔ ڈاکٹر صابرہ سعید کہتی ہیں: '' .... اردو میں جدید خاکہ نگاری کی ابتدا مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکوں سے ہوتی ہے۔''(۳) ''نذیر احمد کی کہانی'' فرحت اللہ بیگ کا ایک زبردست کارنامہ ہے ''نذیر احمد کی کہانی'' لکھ کر انھوں نے اردو خاکہ نگاری میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد جن شخصیتوں نے خاکہ نگاری کے فن کو بامِ عروج

پر پہنچایا ان میں آغا حیدر حسین، عبدالحق، محمد شفیع دہلوی، بشیر احمد ہاشمی، خواجہ غلام السیدین، عبدالرزاق کانپوری، عبدالماجد دریا بادی، رشید احمد صدیقی کے نام سرفہرست ہیں۔

۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک کے افق پر کئی فنکار ابھرے جنھوں نے دیگر اصناف ادب کی آبیاری کے علاوہ خاکہ نگاری کے فن کو بھی پروان چڑھایا۔ ان میں کرشن چندر سردار جعفری، ساحر لدھیانوی اور عصمت چغتائی کے نام نمایاں طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔

عصمت چغتائی کا پہلا خاکہ ''دوزخی'' ہے جو انھوں نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر لکھا ہے۔ اس کے بارے میں سعادت حسن منٹو کی رائے سنئے: ''عصمت نے اپنے محبوب بھائی کی یاد میں ''دوزخی'' لکھا۔ خود اپنے ہاتھوں سے خواہرانہ جذبات چُن چُن کر ایک اونچا مچان تیار کیا اور اس پر نرم نرم ہاتھوں سے اپنے بھائی کی نعش رکھ دی۔ ''دوزخی'' عصمت چغتائی کی محبت کا نہایت لطیف اور حسین اشارہ ہے۔'' (۴)

''دوزخی'' عصمت چغتائی کا ہی نہیں بلکہ اردو ادب کا ایک شاہکار خاکہ ہے۔ اسے ہر لحاظ سے اردو کے بہترین خاکوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے یہ خاکہ اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربات کی روشنی میں لکھا ہے۔ اس کا انداز بڑا دلکش اور پرتاثیر ہے۔ بقول آل احمد سرور'' ...... دوزخی کے نام سے انھوں نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بعض شرفا کو بے رحم اور مریض معلوم ہوتا ہے مگر اردو میں اس رنگ کی پہلی کامیاب کوشش ہے۔ عصمت کے اسلوب میں ایک ایسا زور اور جوش ہے جو پڑھنے والے کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔'' (۵) خلیل الرحمٰن اعظمی کی رائے میں: ''شخصیت نگاری کے سلسلے میں سب سے اہم مضمون عصمت چغائی کا ''دوزخی'' ہے جو انھوں نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی مرحوم پر لکھا ہے۔ یہ مضمون بے لاگ حقیقت نگاری اور شخصی مرقع کشی کی نادر مثال ہے۔'' (۶) بقول حسن عسکری'' .... ''دوزخی'' پورے ترقی پسند ادبی سرمائے میں ایک لازوال تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (۷)

اس خاکے میں کئی خوبیاں ہیں۔ اسے عصمت چغتائی نے اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر لکھا ہے۔ اس کے مطالعے سے عظیم بیگ چغتائی کی پوری زندگی مع اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ خامیوں کو بھی عصمت نے اس انداز سے

ساتھ پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں ان سے نفرت کے بجائے یک گونہ ہمدردی سی ہو جائے مثلاً ایک جگہ لکھتی ہیں:

"شروع ہی سے روتے دھوتے پیدا ہوئے۔ روئی کے گالوں پر رکھ کر پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتا۔ قوی ہیکل بھائی سر جھکا کر پٹ لیتے۔ کچھ بھی کریں والد صاحب کمزور جان کر معاف کر دیتے۔ ہر ایک دل جوئی میں لگا رہتا۔ مگر بیمار کو بیمار کہو تو اسے خوشی کب ہوگی۔ ان مہربانیوں سے احساس کمزوری اور بڑھتا۔ بغاوت اور بڑھتی۔ غصہ بڑھتا، مگر بے بس، سب نے ان کے ساتھ گاندھی جی والی نان وائلنس شروع کر دی تھی—وہ چاہتے تھے کوئی تو انھیں بھی انسان سمجھے۔ انھیں بھی کوئی زندہ لوگوں میں شمار کرے۔ لہٰذا ایک ترکیب نکالی اور وہ کہ فسادی بن گئے۔ جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر اس کے ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان—چٹخارے لے لے کر کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن بھائی ماں باپ سب کو نفرت ہوگئی۔ اچھا خاصہ گھر میدان جنگ بن گیا اور سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود۔ بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہو گئے اور کمزور لاچار ہر دم کا روگی تھیٹر کا ولین ہیرو بن گیا—اور کیا چاہیے۔ ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں۔ زبان بد سے بدتر ہوگئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا۔ ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنا لینا بائیں ہاتھ کا کام ہو گیا۔ لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دنیا انھیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا ان سے کھنچنا شروع کیا۔ اتنا ہی وہ لپٹے آخر میں تو خدا معاف کرے ان کی صورت دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی، بچے باپ نہ سمجھتے، بہن نے کہہ دیا تم میرے بھائی نہیں اور بھائی، آواز سن کر نفرت سے منہ

موڑ لیتے ــــ ماں کہتی 'سانپ' جنا تھا میں نے!"(۸)

اس خاکے کی زبان بھی نہایت سادہ، دلکش اور دل میں اتر جانے والی ہے۔ اسلوب و بیان میں نغمگی اور اچھوتا پن پایا جاتا ہے بقول ڈاکٹر صابرہ سعید"...... عصمت چغتائی کی طبیعت کی طرح ان کا اندازِ بیان بھی بالکل انوکھا اور نرالا ہے ہلکا ہلکا طنز اور مزاج عصمت کا خاص رنگ ہے۔ اندازِ بیان بے حد چبھتا ہوا ہے۔ عصمت چغتائی کے اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی جرأت اور بے باکی ہے۔ اپنے زہر میں بجھے ہوئے قلم سے فریب کا پردہ ہٹا کر حقیقت کو عریاں کرنے میں طاق ہیں۔ زبان بڑی چٹخارے دار استعمال کرتی ہیں۔ عورتوں کی زبان لکھنے میں خاص ملکہ ہے۔"(۹)

نثار احمد فاروقی کے الفاظ میں"...... یہ اسکیچ عصمت نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر لکھا ہے۔ مختصر ہونے کے باوصف اس کی خوبی یہ ہے کہ زبان بہت سادہ اور دل میں اتر جانے والی ہے...... یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے لفظ لفظ میں خون کے آنسو جم گئے ہیں۔ صاف اور سہل زبان، دل کو ہلا دینے والا لب و لہجہ اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی سنسنی۔ عصمت نے جو تاثر پیدا کرنا چاہا ہے اس میں وہ اپنے منشا سے زیادہ کامیاب ہوئی ہیں۔ اچھے خاکوں کی کتنی ہی مختصر فہرست بنائی جائے"دوزخی" اگر اس میں شامل نہیں تو فہرست یقیناً نامکمل رہے گی۔"(۱۰)

عصمت چغتائی نے مجاز سے متعلق کئی خاکے تحریر کیے۔ جن کے نام یہ ہیں "اسرار الحق"، "عشق مجازی اور" "اور وہ۔" مجاز میں اسرار الحق مجاز کے مجموعہ "آہنگ" کا ذکر ملتا ہے، ساتھ ہی ان کی شاعری اور ان کے ناکام معاشقہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے اس کے علاوہ عصمت نے مجاز سے اپنی تین ملاقاتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ گو کہ طرز بیان جذباتی ہے تاہم انھوں نے مجاز کی زندگی کی تصویر کشی اور ان کی حلیہ نگاری بڑے ہی دلکش اور موثر انداز میں پیش کی ہے۔ اسلوبِ بیان کی ندرت اور ان کے مخصوص طنزیہ لہجے کی وجہ سے اس کی دلکشی اور دلچسپی میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

"عشق مجازی" میں عصمت نے مجاز کی شاعری اور ان کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی شاعری میں ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ بالفاظ دیگر

ان کی شاعری میں ان کی شخصیت کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ محبت کی ناکامی کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ اردو کے دیگر شعراء اور مجاز کے درمیان عورت اور محبوب کے تصور میں جو فرق تھا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''ایک چیز جو مجاز کے یہاں پائی جاتی ہے۔ وہ کسی دوسرے شاعر میں اتنی واضح اور ابھری ہوئی نہیں ہے۔ محبوب اور عورت کا تصور بیحد انوکھا اور اصولِ شاعری سے ہٹا ہوا ہے۔ پرانی شاعری میں محبوب حسن و جمال کی پوٹ ہوتا تھا۔ اس کے اپنے چند مخصوص حربے ہوتے تھے اور چند انداز جو وقتاً فوقتاً استعمال کرتا تھا۔ مگر اس کے سارے انداز نہایت اجنبی سے معلوم ہوتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ معشوق ہی کا ذکر ہے یا کسی جابر اور قہار شہنشاہ کا ذکر ہے: جسے عشقیہ غزل میں سمو دیا گیا ہے اور پھر میں سوچتی ہوں کہ بھئی یہ شاعر تو بڑے ترقی پسند ہوں گے مگر بے چارے شہنشاہ کے خوف سے کچھ نہ کہہ پاتے ہوں گے۔ پر دل کی بھڑاس نکالنے کو معشوقاؤں کی آڑ میں سب کچھ کہہ گئے۔ غرض ان کے یہاں سوائے خوبصورت زبان اور تشبیہات کے انسانی حسن کہیں نظر نہیں آتا۔ مجاز وہ شاعر ہے جس کی محبوبہ اسی دنیا کی عورت ہے۔''(۱۱)

''اور وہ'' کوئی خاکہ نہیں ہے۔ مجاز کے مرنے کے بعد انھوں نے ''نیا دور'' کراچی کے شمارہ ۳۔۴ ۱۹۵۶ء میں ''اور وہ'' کے عنوان سے ایک نوٹ لکھا ہے۔ اسے مجاز کے خاکے کا تتمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''مجاز کو جب میں نے دیکھا تو وہ نوجوان لڑکیوں میں ایسا مقبول تھا کہ بہت سی لڑکیاں اس کی رفیقہ بننے کے خواب دیکھا کرتی تھیں، مگر یہ کیا ہوا کہ مجاز ناشاد اور نامراد دنیا سے چل دیا۔ یہ کیوں ہے کہ لڑکیاں مجاز سے عشق کریں۔ مگر جب شادی کا وقت آئے تو وہ تجوریاں سے شادی کریں؟ سماج کے یہ حالات ایسے تھے جن سے مجاز لڑا ___

ایک لڑتا ہے اور سینکڑوں کی ہمت بڑھتی ہے، اگر وہ چاہتا تو اچھی نوکری کرتا، خوبصورت لڑکی سے شادی کرتا، اور آرام کی زندگی گزارتا۔

مجازؔ سے اور ان کے گھر سے میرے ایسے تعلقات تھے جو خون کے رشتے سے زیادہ وقیع تھے۔ میں نے اکثر مجازؔ کو اس کی بعض عادتوں پر ڈانٹا اور کبھی یہ بھی غصے میں کہا" اس سے بہتر ہے کہ مجازؔ تم مرجاتے"
— مجازؔ نے جیسے میرے منہ پر طمانچہ مار دیا اور کہا— تو میں مرگیا— تم اس کو بڑا کام سمجھتی تھیں۔ "(۱۲)

"منٹو میرا دوست میرا دشمن" ایک عمدہ خاکہ ہے اس میں عصمت نے منٹو کی زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں طور پر اجاگر کیا ہے۔ ان کی شکل وصورت کا نقشہ بھی بالکل جیتے جاگتے انداز میں کھینچا ہے۔ ساتھ ہی ان کی بیماری، محبت اور زندگی کے متعلق ان کے نظریات، شادی بیاہ اور بیوی کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ منٹو کی رسم وراہ طوائفوں سے بھی تھی اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ پھر ان کے انداز گفتگو اور بحث ومباحثے، جھگڑے، تکرار وغیرہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ قاری کے روبرو منٹو اپنی زندگی کی پوری مصروفیات کے ساتھ جلوہ نما نظر آتے ہیں۔ منٹو سے اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے عصمت لکھتی ہیں:

"............ چرچراتی گرد آلود سیڑھیاں طے کر کے ہم دوسری منزل پر پہنچے۔ فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔ ڈرائنگ روم نما کمرے کے ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا سفید اور صاف پلنگ پڑا تھا۔ کھڑکی سے ملی ہوئی ایک لدی پھندی بڑی سی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک مکوڑے کی شکل کا انسان اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

"آیئے آیئے۔" بڑی خندہ پیشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا۔ منٹو ہمیشہ کرسی پر اُکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھینچ کر اسکا قد خاصا لمبا نکل آتا تھا اور بعض وقت جب منٹو یوں رینگ کر کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہریلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر

کھدر کا کرتہ پاجامہ اور جواہر کٹ صدری تھی۔''(۱۴)

عصمت اپنی دوسری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''ایک دن جب ہم مسلاڈ میں رہتے تھے۔رات کے کوئی ساڑھے بارہ ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی معلوم ہوا صفیہ سانس پھولی ہوئی سی کھڑی ہیں۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ بولی''میں نے منع کیا کہ ایسی حالت میں کسی کے گھر نہیں جانا چاہیے مگر وہ کہاں سنتے ہیں''

منٹو مع نندا جی اور خورشید انور کے آ گئے —

''یہ صفیہ کون ہوتی ہے منع کرنے والی''— ہاتھ میں بوتل اور گلاس لئے تینوں در آئے شاہد نے پارٹی کو لبیک کہا۔ طے ہوا بہت بھوکے ہیں ہوٹل سب بند ہو چکے ہیں۔ ریل کا وقت گزر گیا۔ کچھ مل جائے تو خود پکا کر کھالیں۔ بس آٹا دال دے دو— خود باورچی خانے میں جا کر پکالیں گے۔ صفیہ کو مردوں کا روٹی پکانا قطعی نہ بھایا۔ مگر وہ کہاں مانتے تھے۔ باورچی خانے پر چڑھائی کردی منٹو آٹا گوندھنے لگے۔ نندا جی انگیٹھی پر ٹوٹ پڑے۔ اور خورشید انور کو آلو چھیلنے کو دیئے گئے جو وہ چھیلنے سے زیادہ کچے کھانے پر مصر تھے اور پھر بوتل بھی باورچی خانے میں آ گئی— لوگ پھسکڑا مار کر وہیں بیٹھ گئے اور کچے کچے پراٹھے پکائے گئے کھائے گئے— منٹو نے آٹا بہت اچھا گوندھا اور بڑے سلیقے سے روٹی پکالی اور پھر جھٹ سے پودینے کی چٹنی پیس ڈالی کھانا کھا کر یہ لوگ وہیں پھیل کر سو بھی جاتے اگر زبردستی برآمدے تک نہ گھسیٹا جاتا۔

یہ زندگی تھی جو منٹو کو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ معقول آمدنی ہو۔ پینا پلانا ہو قہقہے ہوں اور بے فکریاں۔ ہر بات مذاق معلوم ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں لاہور گورنمنٹ نے میرے اور منٹو پر مقدمہ چلا دیا۔ منٹو کی دیرینہ آرزو برآئی۔ لاہور میں بھی لطف آ گیا۔

خوب دعوتیں اڑائیں۔ اسی بہانے لاہور کی زیارت ہوگئی۔ زری کے جوتے خریدنے ہم دونوں ساتھ گئے۔ منٹو کے پیر بہت نازک اور سفید تھے جیسے کنول کے پھول۔ زری کے جوتے بہت جچنے لگے۔''(۱۴)

عصمت منٹو کی فلمی مصروفیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''......منٹو اس وقت فلستان میں قریب قریب مستقل تھا۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا۔ مدح سرائی جو اس کی زندگی کا سہارا تھی اسے ملتی تھی کہ اس کی فلم ''آٹھ دن'' کامیاب نہ ہوئی۔ نہ جانے کیوں وہ فلستان چھوڑ کر اشوک کمار کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا۔ اسے اشوک کمار بہت پسند تھا۔ مکرجی نے نہ جانے اسے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ ایک دم اس کے خلاف ہو گیا۔

''بکواس ہے مکرجی۔ فراڈ ہے پکا!'' وہ تلخی سے کہتا۔

بمبئی ٹاکیز میں جا کر اس نے مجھے بھی کمپنی میں ایک سال کے لئے سینیر یو ڈیپارٹمنٹ میں کام دلوایا اور بہت ہی خوش ہوا۔ ''اب ہم دونوں مل کر کہانی لکھیں گے۔ تہلکہ مچ جائے گا میری اور آپ کی کہانی اشوک کمار ہیرو۔ بس پھر دیکھئے گا——

ایک کہانی منٹو کی زیر غور تھی۔ اشوک کمار کو وہ پسند تھی اس سے پہلے اسے ''مجبور'' کی کہانی پسند تھی پھر دل سے اتر گئی اور منٹو کی کہانی پسند آئی۔ میرے آنے کے بعد اسے میری کہانی ضدی پسند آ گئی۔ خیر منٹو کو ناگوار نہ گزرا، اب اشوک کمار نے مجھ سے منٹو کی کہانی پر کام کرنے کو کہا منٹو کو میری کہانی پر! نتیجہ یہ ہوا منٹو مجھ سے اور میں منٹو سے شاکی ہونے لگے۔ اُدھر کمال امروہی ''محل'' کی کہانی لے کر آ گئے اور اشوک کمار کو وہ پسند آ گئی اور ہم دونوں کی کہانی کھٹائی میں پڑ گئی۔ اب صرف عزت کا سوال ہوتا تو اور بات تھی۔ وہاں تو یہ حال ہو گیا کہ ہماری کہانی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی شمار و قطار ہی میں نہیں گو ہم

سے کہہ دیا گیا تھا کہ چین سے بیٹھو۔ تنخواہ ملتی رہے گی کیونکہ کنٹریکٹ ہو چکا ہے...... مگر منٹو کی کہانی رہ گئی! منٹو دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی کہانی کی ادھیڑ بن کیا کرتا کبھی انجام کو آغاز بنا کر لکھتا کبھی آغاز کو انجام بنا کر کبھی وسط سے شروع کر کے آغاز پر ختم کرتا اور وسط کو انجام بنا دیتا باوجود ہزاروں آپریشنوں کے کہانی کی کوئی کل اشوک کمار کو پسند نہ آئی مگر منٹو یہی کہتا ــــ

''آپ گنگولی کو نہیں سمجھتیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ وہ میری کہانی میں ضرور کام کرے گا۔''

''آپ کی کہانی میں اس کا رول رومینٹک نہیں باپ کا ہے۔ وہ کبھی نہیں کرے گا۔'' اور منٹو سے پھر لڑائی ہونے لگتی مگر دبی زبان سے یہاں اپنی فکر پڑی تھی اور وہی ہوا کہ ''ضدی'' اور ''محل'' بن گئیں۔ منٹو کی کہانی رہ گئی۔ منٹو کو اس کی امید نہ تھی اور اسے بڑی ذلت محسوس ہوئی۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا بے قدری نہیں جھیل سکتا تھا۔'' (۱۵)

عصمت منٹو کی موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''......... منٹو ہی نہیں عرصہ ہوا میرے اور منٹو کے درمیان بہت کچھ مر چکا تھا۔ آج صرف ایک کسک زندہ ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس بات کی کسک ہے؟ کیا اس بات کی ندامت ہے کہ وہ مر چکا اور میں زندہ ہوں؟ یہ میرے سینے پر پھر قرض جیسا بوجھ کیوں ہے۔ مجھے تو منٹو کا کوئی قرضہ یاد نہیں اور اس کا قرضہ بھی کیا تھا، یہی نا کہ اس نے مجھے بہن کہا تھا۔ مگر بہنیں تو کھڑی بھائیوں کو دم توڑتا دیکھتی ہیں اور کچھ نہیں کر پاتیں......... نہ جانے دل کیوں کہتا ہے کہ منٹو کی اس جواں مرگی میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ میرے دامن پر بھی خون کے نظر نہ آنے والے چھینٹے ہیں! جو صرف میرا دل دیکھ سکتا ہے۔ وہ دنیا جس نے اسے مرنے دیا بری ہی تو دنیا ہے۔ آج اسے مرنے دیا اور

کل یونہی مجھے بھی مرجانے کی اجازت ہوگی اور پھر لوگ ماتم کریں گے۔ میرے بچوں کا بوجھ ان کے سینے پر چٹان بن جائے گا۔ جلسے کریں گے۔ چندے جمع کریں گے اور جلسوں میں عدیم الفرصتی کی وجہ سے کوئی نہ آسکے گا۔ وقت گزر جائے گا سینے کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو جائے گا اور وہ سب کچھ بھول جائیں گے۔" (۱٦)

"خواجہ احمد عباس" یہ خاکہ عصمت نے خواجہ احمد عباس کی شخصیت سے متاثر ہوکر تحریر کیا ہے۔ انھوں نے خواجہ احمد عباس کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس لئے ان کے خاکے میں حقیقت کی چاندنی قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف عباس کی شکل وصورت ہماری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے، بلکہ ان کے مزاج اور ان کی زندگی کی جھلکیاں بھی واضح طور پر دکھائی دینے لگتی ہیں۔ ایک جگہ عصمت لکھتی ہیں:

"باچھو! ڈھیر ساری بہنوں کا اکلوتا بھائی اپنی نسل کا واحد ساربان، جو بے عیب نہایت معمولی مگر چکنی مٹی کا بنا ہوا ہے عجیب چوں چوں کا مربہ ہے۔ آدمی کیا عجیب بیچ شاخہ ہے۔ ایک ایسا کٹر سید کہ شراب نہیں پیتا، سگریٹ جلاتا ہے مگر دھواں پھیپھڑوں تک نہیں کھینچتا، پان تمباکو سے دور کا واسطہ نہیں، فلیش کھیلتا ہے، بے دلی سے صرف لفنگوں کا ساتھ دینے کے لئے پینے پلانے کی دعوتوں میں بیٹھا بور ہوا کرتا ہے۔" (۱۷)

عصمت نے نہ صرف خواجہ احمد عباس کی خوبیوں پر ہی روشنی ڈالی ہے بلکہ ایمانداری کا تقاضا پورا کرتے ہوئے ان کی خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے:

"اس ٹیڑھے میڑھے انسان میں جملہ چھوٹی موٹی برائیوں کے ساتھ سب سے بھیانک برائی یہ ہے کہ وہ کبھی لائق شوہر نہ بن سکا اور نہ کچھ آثار نظر آتے ہیں۔ وہ ایک لاجواب دوست بن سکتا ہے، زناٹے دار کہانیاں لکھ سکتا ہے۔ فی البدیہہ دھواں دھار تقریریں جھاڑ سکتا ہے۔ جُٹ جائے تو دنیا کا تختہ اُلٹ سکتا ہے۔ مگر اس میں کسی کا "سرتاج من سلامت" بننے کا بیج ہی نہیں ہے۔ وہ کسی کا ہو کے رہنے کا قائل

نہیں، خواہ وہ کوئی جذبہ ہو یا پارٹی، کوئی اصول ہو یا کوئی بُت کا فر اگر اس
کا ضمیر کسی بندھن کے خلاف گواہی دیتا ہے تو اسے توڑ پھینکتا ہے۔
اسے کسی یقین یا رواج کی رسیوں میں جکڑنا ممکن ہی نہیں۔ وہ نہ کسی کو
اپنی جاگیر سمجھتا ہے اور نہ کسی کی ملکیت بن کر جی سکتا ہے۔"(۱۸)

خواجہ احمد عباس نہایت شریف، مخلص اور مہمان نواز انسان ہیں۔ ان کی مہمان نوازی پر تبصرہ کرتے ہوئے عصمت لکھتی ہیں:

"عباس کا ایک خوبصورت سا گھر ہے۔ جہاں سوائے اس کے ہر
شخص گھر والا نظر آتا ہے۔ عموماً گھر پر مہمان ہی کا قبضہ رہتا ہے۔
لوگ نہایت ہی دریا دلی سے اس کے بستر پر سوتے ہیں۔ تولیہ، چادر
استعمال کرتے ہیں۔ اس کے کُرتے پاجامے پہن کر جاتے ہیں اور
اسے اپنا آبائی حق سمجھتے ہیں۔ کھانے کی میز پر اگر جگہ نہ ہو تو وہ سب
سے پہلے کونے میں رکابی تھام کر کھڑا ہو جائے گا۔ اپنے گھر کا صاحب
نہیں کوئی اٹھائی گیرا مفت خور بن بلایا مہمان نظر آنے لگتا ہے۔"(۱۹)

خواجہ احمد عباس سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"ٹھیک یاد نہیں، شاید عباس کو میں نے سب سے پہلے علی گڑھ کے کسی
مقابلۂ تقریر کے موقع پر کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے سے چقوں کے
پیچھے سے دیکھا تھا۔ ایک نہایت ہی منحنی لڑکا سر پر ڈھیروں بال اٹھائے
اپنی زناٹے دار تقریر کے ذریعہ زمین و آسمان ایک کئے دے رہا تھا
اور سب حسبِ دستور میرے آس پاس بیٹھی ہوئی زیادہ تر لڑکیاں اس
پر عاشق ہو چکی تھیں یا ہونے والی تھیں۔ اس میں وہ بُت طناز بھی جلوہ
افروز تھی جس پر عباس بھی مرتا تھا، یا شاید اس کی دوسری یا تیسری
بہن ہوگی۔ گرلز کالج کی لڑکیوں میں یہ افواہ گرم تھی کہ عباس بیک
وقت کئی بہنوں پر عاشق تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ سارے خاندان
پر بُری طرح فریفتہ تھا اس لئے نہیں کہ موٹی وبا تھی بلکہ صرف اس

لئے کہ وہ سارا خاندان ہی نہایت تعلیم یافتہ اور پروگریسو تھا۔ ہزار لعنتوں کے باوجود سب لڑکیوں نے اعلیٰ تعلیم پائی تھی اور نوکریاں کر رہی تھیں اس میں یہ نہایت باغیانہ اقدام تھا۔ لہٰذا عباس کو لامحالہ ان پر فریفتہ ہونا پڑا اور شاید وہ کسی حسینہ کا نہیں حسین خیال پر ایک جان چھوڑ ہزار جان سے عاشق تھا۔'' (۲۰)

عصمت خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ان کے اصول ونظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''میں نے عباس کو دیکھا ہے، دور سے بھی، پاس سے بھی نفرت بھی کی ہے، اور سنگ مرمر کا بت بنا کر طاق میں بٹھانے کی کوشش بھی کی ہے اور جب خاک کا پتلا اوندھے منہ گرا ہے تو اسے ہٹا کر خاک کرنے کو بھی جی چاہا ہے۔ مگر جب خاک کے تودے آنکھوں میں پہاڑ بن کر کھٹکنے لگے ہیں، تو جھنجھلاہٹ بھی آئی ہے۔ میں نے قہقہے بھی سنے ہیں اور آنسو بھی دیکھے ہیں۔ وہ رات جب دو چار دن کی بیاہی دلہن کو لے کر اچانک مدد میں ملنے چلا آیا تھا۔ اور رات بھی جب بمبئی ہاسپٹل کے سامنے وہ دوستوں کے مجمع میں اکیلا کھڑا تھا۔ دفن کا مسئلہ درپیش تھا کہ کن عقائد کے مطابق ہو۔ مگر سب سہمے کھڑے تھے۔ عباس سے پوچھنے کی کسی میں بھی ہمت نہ تھی جیسے خود اس کے دفن کا مسئلہ ہو اور وہ پوچھ بیٹھے کہ۔

''کیا موت کا بھی کوئی عقیدہ، مذہب یا ایمان ہے؟ تو کون جواب دے گا؟

اس لئے میں جانتی ہوں عباس حسین سے حسین اور نازک ہاتھ پیر، کان یا ناک سے عشق نہیں کرتا۔ وہ تو اپنے اس اصول سے عشق کرتا ہے جس کی رُو سے ہر پیروں تلے کچل جانے والی ہستی کو اٹھا کر ماتھے سے لگانا فرض انسانیت ہے۔ اس نے زندگی میں عورت کی ہر صورت

میں بے قدری اور گت دیکھی ہے۔والدین کی موجودگی میں یتیم
سہاگن ہوکر بیوہ اور ماں بن کر بانجھ ہونے کی لعنت میں گرفتار دیکھا
ہےاور کلیجے میں ٹیسیں اٹھی ہیں۔
مگر پھر بھی میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ دنیا کی حسین ترین عورت
اگراس کی گردن میں اپنی حسین باہیں حمائل کردے اور کہے۔
''جانِ من! آج قومی اتحاد کے جلسے میں نہ جاؤ۔نہیں تو میں تمہارے
فراق میں گھل مل کر جان دے دوں گی۔''
تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کے موم کی طرح پگھل جائے گا اور کلیجے پر پتھر
رکھ کر مرمریں باہیں میلے مفلر کی طرح اتار پھینکے گا اور چلا جائے گا۔
کیونکہ عباس ایک اصول ہے—ایک یقین ہے—ایک ارادہ
ہے—''(۲۱)

''چراغ روشن ہیں''عصمت چغتائی کا تحریر کردہ ایک بہترین خاکہ ہے۔اس خاکے میں انھوں نے کرشن چندر سے اپنی پہلی ملاقات سے لے کر ان کی گھریلو اور ادبی زندگی کے سارے حالات مفصل طور سے تحریر کئے ہیں۔ان کی پہلی بیوی اور دوسری بیوی سلمیٰ صدیقی سے ان کے مراسم پر بھی روشنی ڈالی ہے۔کرشن چندر عصمت کے ایک پیارے دوست کی حیثیت رکھتے تھے۔اس لئے دونوں کے درمیان کوئی تکلف نہیں تھا۔کرشن چندر سے اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''کرشن کو یوں سامنے جیتا جاگتا دیکھ کر دل میں سنسناہٹ سی ہونے
لگی۔وہ اس وقت سی گرین سوٹ اور سرخ ٹائی میں بے طرح بچ
رہے تھے۔چھوٹے قد کے باوجود خاصے ہینڈسم لگ رہے تھے۔تب
ان کے سر پر پورے گھنے بال تھے۔اس کے بعد میں نے انھیں کبھی
یوں سجا بنا نہیں دیکھا۔جب بمبئی میں دوسری بار ملاقات ہوئی تھی تو وہ
گنجے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ملگجی سی قمیض اور یوں ہی سی پتلون میں
کچھ کھوئے ہوئے سے اکتائے ہوئے بیٹھے تھے۔منٹو کے گھر میں

چند لوگ جمع ہو کر پی رہے تھے۔ منٹو کی زبان سے پھلجڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ وہ بار بار کرشن کو باتوں کے سلسلے میں گھسیٹتا مگر کرشن کچھ چپکے سے نہایت مختصر جواب دے دیتے۔ پھر وہ پنجابی میں کچھ خوں خاں شروع کر دیتا مگر کرشن جیسے اسے بچہ سمجھ کر ٹال رہے تھے۔ وہ ہولے سے مسکراتے اور ان کی حساس آنکھیں کہیں دور خلا میں کچھ ڈھونڈھنے لگتیں۔'' (۲۲)

کرشن چندر نے اپنی ادبی زندگی کے اوائل میں بڑی پریشانیاں جھیلی ہیں۔ وہ ہمیشہ تنگ دست رہتے تھے۔ بیوی سے روز جھگڑا ہوتا تھا۔ مکان کی تکلیف تھی ہی اکثر فٹ پاتھ پر شب گزارتے تھے۔ لیکن اس کے باوصف ادب کی خدمت میں سرگرمی کے ساتھ منہمک رہتے تھے۔ عصمت چغتائی اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

''ایک دن عجیب حلیہ سے چلے آرہے ہیں۔ اندر آئے تو سڑانڈ کا ایک بھبکا بھی ساتھ داخل ہوا۔

''عباس گھر پر نہیں!'' معذرت پیش کی ——''عباس اور مجی کسی فلم کے پریمیئر میں گئے ہیں—

''بیٹھو''—

''شاہد کا کرتہ پاجامہ مل جائے گا—اور تھوڑا سا پانی''!

یہ تھوڑے سے پانی کے بس کی بات نہیں معلوم ہوتی— کیا آج موری میں پھسل پڑے۔'' میں نے صاف کپڑے گرم پانی اور تولیہ غسلخانہ میں رکھوا دیا—نہا کر نکلے تو شاہد آگئے اور شغل شروع ہو گیا۔ کرشن نے اس دن کچھ نہیں بتایا—ایک دن مہندر ناتھ ملے تو کہنے لگے کرشن اکثر فٹ پاتھ پر شب گزاری کیا کرتے ہیں۔ کئی کئی دن کے لئے غائب ہو جاتے۔ وہاں زمانہ بھر کے قسمت کے ستائے انسانوں میں گھل مل کر ان کا درد اپنے دل میں سمو لیتے ہیں۔ وہاں کسی کو نہیں معلوم ہوتا کہ کون ہیں کیا کرتے ہیں۔ وہاں سے کھانسی بخار لے کر

لوٹتے ہیں اور بیوی سمجھتی ہے وہ کسی محبوبہ دل نواز کے پہلو میں داد عیش دے رہے ہوں گے۔ حالانکہ ان کی سب سے بڑی محبوبہ ان کی افسانہ نگاری ہے، جس کی لگن میں انھیں تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔'' (۲۳)

عصمت چغتائی اس سلسلہ میں آگے لکھتی ہیں:

''کرشن کبھی فٹ پاتھ یاد آتے ہیں۔ فٹ پاتھ کیسے بھول سکتا ہوں۔ اپنی زندگی کا بہترین سرمایہ فٹ پاتھ پر پایا، سوچنا، سمجھنا، سیکھنا، لکھنا تو بعد کی بات ہے اصل چیز تو سوجھ بوجھ ہے۔ بیماری نے مجھے زندگی کے دھارے سے کاٹ دیا ہے۔ اب تو ادھار کے لمحوں پر جی رہا ہوں۔'' (۲۴)

عصمت چغتائی کرشن چندر کی محبت، شہرت وعظمت اور عوام وخواص میں بڑھتی ہوئی مقبولیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''کرشن نے ہمیشہ دو محبت کرنے والے دلوں کی اپنی تحریر میں ستائش کی۔ ان کی کہانیاں پکار پکار کر انسان کے لئے جینے کا حق مانگتی ہیں ــــ انھوں نے پیار بھرے دلوں کا درد اپنی ہستی میں سمو لیا تھا اور خود چور بنے بیٹھے تھے۔ جیسے انھیں جینے کا حق نہیں تھا۔ وہ کولہو کے بیل تھے۔ ان کی گردن پر جوا رکھا تھا۔ اسے اتار پھینکنے کا حق نہیں تھا۔ مگر کرشن زندگی کے عجیب موڑ پر ایک سر پھری سے دیوانوں جیسا پیار کر بیٹھے تھے۔ جملہ پابندیوں میں زندگی گزارنے کے بعد بھی اس میں جھوٹے بندھن توڑ دینے کی ہمت تھی۔ کرشن کے سوا اسے کوئی نظر نہ آتا تھا۔ سوائے کرشن کی پکار کے ہر آواز کے لئے اس کے دل و دماغ کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے والدین کا والہانہ عشق دیکھا تھا اور زندگی سے ویسا ہی انعام چاہا تھا۔ محبت جو ایک جادو ہے۔ جس کے عدم اور وجود پر کسی کا اجارا نہیں ہو سکتا کوئی راہِ فرار نہیں ہوتی ــــ مگر ہاتھ بڑھا کر جام اٹھانے کی ہمت بہت کم ہوتی ہے۔

سلمیٰ کا وجود کرشن چندر کو خوب راس آیا۔ ان کی زندگی کا ڈھانچہ ہی
بدل گیا۔ ساحر، بیدی اور مجروح کے مرتبہ پر پہنچ گئے۔ میرا مطلب
ہے مالی طور پر موٹر بھی خرید لی گو زیادہ دن نہیں چلی۔ مگر خرچہ شاہانہ ہی
رہا۔ ان کی مقبولیت عوام سے بڑھ کر خواص تک پہنچ گئی۔ وہ جنھوں
نے انھیں پڑھا بھی نہیں تھا ان پر بھی دھاگ بیٹھ گئی۔ ان کی مقبولیت
کو چار چاند لگ گئے۔ پاکستان میں ان کی مقبولیت اور شہرت بڑھتی
گئی وہاں منٹو کی بے قدری ہوئی ہو لیکن کرشن اردو ادب پر چھائے
ہوئے ہیں۔ روسی اور دوسری زبانوں میں ان کی مقبولیت پھیل گئی۔
پاکستان کے ایک رسالے نے تو باقاعدہ کرشن کے بارے میں رائے
عامہ جمع کر کے ایک نمبر مرتب کیا اور ثابت کر دیا کہ کرشن چندر برصغیر
کے مقبول ترین اور سب سے بلند مصنف ہیں۔" (۲۵)

عصمت چغتائی کرشن چندر سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"کرشن سے میری آخری تفصیلی اور بے تکلف ملاقات خود میرے
گھر پر ہوئی۔ چند دوستوں کے ساتھ میں نے انھیں کھانے پر بلایا۔
اتفاق سے وہ اس دن ریڈیو کے کام سے بمبئی آ رہے تھے۔ وہاں
سے وہ کوئی تین بجے میرے گھر پہنچ گئے۔ بہت عرصہ بعد وہ پلنگ پر
نہایت بے تکلفی سے لیٹ گئے۔ اور باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ میں
نے آرام کرنے کو کہا۔ مگر وہ باتوں کے موڈ میں تھے۔ مختلف موضوعات
پر تین چار گھنٹے مسلسل باتیں کرتے رہے۔ منٹو کا ذکر نکل آیا۔ اسے
یاد کر کے ہنستے اور آنسو پیتے رہے۔

"کرشن تم کبھی رنڈیوں کے پاس گئے۔"

"نہیں مجھے پیشہ ور عورتوں سے وحشت ہوتی ہے۔ میرے والد جو
ڈاکٹر تھے۔ جیل سے وابستہ تھے۔ وہاں پیشہ ور عورتیں گرفتار ہوتی
تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے عبرت ہوتی تھی۔""

''پیشہ ور اور شریف زادی میں کیا فرق ہے''؟
''وہی جو تاج محل ہوٹل اور فٹ پاتھ پر لگے خوانچے میں ہے۔'' پیٹ تو دونوں جگہ بھر جاتا ہے۔''
تاج اور شیرٹن کے کھانے سے پیٹ کے ساتھ دماغ بھی آسودہ ہو جاتا ہے اور فٹ پاتھ کے کھانے سے خونی پیچش کے جراثیم سے پالا پڑتا ہے۔''
''شادی بھی تو اکثر پیشہ ہی بن جاتی ہے۔ جو عورت صرف روٹی کی خاطر شادی کرتی ہے اس میں اور ٹکہیائی میں کیا فرق ہے''؟
''صرف نام کا فرق ہے''۔(۲۶)

کرشن کے متعلق عصمت چغتائی مزید لکھتی ہیں:

''......کرشن کے سینے میں پیس میکر لگا ہوا ہے۔ لاکھوں دلوں کی دھڑکن بے تار برقی ان کے دل سے جڑی ہوئی ہے۔ ان کا دل ان الفاظ میں دھڑک رہا ہے جو کاغذ کے صفحوں پر آویزاں ہیں ان کا دل کیسے چپ ہو سکتا ہے؟ وہ تو ہمیشہ بولتا رہے گا موت کی انجانی ٹھوکر سے پلگ نکل جاتا ہے۔ دم بھر کو لگتا ہے سب چراغ بجھ گئے اب کبھی نہ جاگیں گے۔
مگر سلسلہ پھر جڑ جاتا ہے۔ آنے والی نسلوں کے لئے جلائے ہوئے چراغوں میں فنکار کے دل کی دھڑکن مقید ہے۔ اور چراغ روشن ہیں۔''(۲۷)

''خوابوں کا شہزادہ'' عصمت چغتائی کا ایک شاندار خاکہ ہے۔ اس خاکے میں انھوں نے سجاد ظہیر عرف بنے بھائی سے اپنی پہلی ملاقات سے لے کر ان کے عادات و اطوار، سیرت و صحت، اندازِ گفتار و کردار کو بڑے ہی دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ اس خاکے کا مطالعہ کرنے سے سجاد ظہیر جو ترقی پسند تحریک کے میر کارواں سمجھے جاتے ہیں، ان کی تمام تر مصروفیات بالخصوص تحریکی سرگرمیوں کی گہما گہمی بیک وقت ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

عصمت سجاد ظہیر سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''سب سے پہلے میں نے زندگی میں بنے بھائی کو ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی پہلی میٹنگ میں دیکھا۔ میں نے لکھنا شروع نہیں کیا تھا، لیکن انگارے پڑھ چکی تھی۔ رشیدہ آپا سے پرانا رشتہ تھا، سنا تھا میٹنگ میں انگارے کے افسانوں کے مصنفین کے درشن ہوں گے اسی لئے ہم چند منچلے وہاں کسی طرح چکر لگا کر پہنچ گئے تھے۔ وہاں بنے بھائی کو دیکھ کر کچھ اوس سی پڑ گئی تھی ہم سمجھتے تھے کہ انگارے کے تخلیق کار کچھ شعلہ اگلتے ہوئے دھواں دھار قسم کے ہوں گے، مگر بنے بھائی بڑے پیار اور نرمی سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے، قطعی تیرو تفنگ سے دور کی تعمیر اور تخلیق کی باتیں...... بنے بھائی اس وقت بہت دبلے اور زرد رو تھے اس کے باوجود ان کے چہرے پر اس زمانے کے تمام جوشیلے نوجوانوں جیسی جھلاہٹ اور بے چینی نہیں تھی۔ بڑی معصومیت اور سادگی تھی جیسے انقلاب لانے نہیں پھولوں کا گلدستہ سنوارنے کا پروگرام بنا رہے ہوں۔ ایک دھیمی لئے ازلی مسکراہٹ تو ان کے سارے وجود پر طاری ہی رہتی تھی ہر بات خوش دلی سے کرتے...... لوگوں سے زیادہ بنے بھائی ہی ہماری گفتگو کا موضوع بنے کیونکہ وہ ایک معمہ تھے۔ وہ ضرورت سے زیادہ پُرسکون تھے ان کے وجود میں کہیں کیل کانٹے نہیں نظر آتے تھے۔ ان کا کوئی جملہ دماغ میں سوئی کی طرح نہیں چبھتا تھا تو پھر وہ کیوں یاد رہے۔ کیوں ان کی طرف توجہ مبذول ہونے پر مجبور ہوئی یاد نہیں۔'' (۲۸)

سجاد ظہیر عرف بنے بھائی یوں تو سماجی وسیاسی، ادبی وغیر ادبی امور میں انقلاب کے خواہاں تھے اور جا بجا ان کی تحریر وتقریر سے یہ امر واضح بھی ہوتا ہے لیکن ازدواجی زندگی میں داخل ہونے پر وہ غیر انقلابی ہونے کے ساتھ ساتھ سادگی پسند زندگی کو فوقیت دی۔ جو شادیاں سماج میں رائج ہیں اسی پر اکتفا کیا۔ بقول عصمت:

''بنے بھائی کی شادی ہوگئی تھی یا نہیں لیکن جب شادی ہوئی تھی تو بڑے مباحثے ہوئے تھے۔ سنا ہے لومیرج بھی نہیں تو بھلا یہ کیسے انقلابی ہیں کہ عشق بھی نہیں چلایا بھلا خود انسانی حقوق کے لئے لڑتے پھرتے ہیں اتنے دن ولایت رہ کے آئے چلو میم وغیرہ نہیں تو اپنے ہی دیش میں کوئی عشق وغیرہ چلاتے۔ اس زمانے میں ہم لڑکیوں کو باغیانہ قسم کے معاشقوں سے بڑی تھرل محسوس ہوتی تھی...... سنا گھر والوں نے اپنی پسند سے لڑکی ڈھونڈی اور یہ دولہا بن کے گئے اور شادی کر لی۔ کچھ یاد نہیں پڑتا لیکن دولہا دولہن کی ایک تصویر نہ جانے کہاں سے ہتھے چڑھ گئی دیکھ کر دل ڈوب گیا کہ باقاعدہ دھوم دھام سے شادی کی نہ کسی نے عاق کرنے کی دھمکیاں دی نہ کچھ بارود بازی ہوئی۔ ایک ایسے سادھارن معمولی انسان کا پھر لوگ آپس میں اتنا ذکر کیوں کرتے تھے ان کے چرچے کیوں تھے۔ بنے بھائی ہماری توجہ کے مرکز کیوں بنے تھے۔ سنا تھا شراب بھی پی کر اودھم نہیں مچاتے یا خدا یہ کیسے انقلابی ہوئے کہ ان کی شادی میں مانجھ اُبٹن تک ہوا پورے پکّے دولہا بنے یہ سب نہایت غیر انقلابی حرکتیں ہیں۔'' (۲۹)

عصمت نے اس خاکے میں جہاں انقلابی ذہن و شعور کو جلا بخشی ہے وہیں انھوں نے سماج میں مروجہ فرسودہ رسومات اور دقیانوسی خیالات کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ انھوں نے اس خاکے کے توسط سے عام و خاص کو متنبہ کیا ہے کہ ان کی سماجی بدحالی اور اقتصادی زبوں حالی کا سبب موجودہ حکومت نہیں بلکہ ان کی اپنی پروردہ رسومات اور فضول اخراجات ہیں جو کسی طرح سے بھی مہذب سماج کے جزو نہیں ہو سکتے۔ فی الواقع ہمارے اصل دشمن ہماری توہم پرستی، اقتصادی اور سیاسی محرومیاں جو ہمارا مقدر بن چکی ہیں، صفحۂ ہستی سے مٹانا مقصود و مطلوب ہے۔ بنے بھائی کے ذہنی افکار کو واشگاف کرتے ہوئے عصمت لکھتی ہیں:

''بنے بھائی یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہماری رسم اور مذہبی روایتیں اگر ہم نہ چاہیں تو ہماری دشمن ثابت نہیں ہو سکتی نہ خاندان کی پرانی روایتیں

ہمارا کچھ بگاڑ سکتی ہیں۔ خود اپنے آپ سے لڑنا ہم سب کی بربادی ہے۔ اصل دشمن کو پہچانو اور اس کا مقابلہ کرو۔'' (۳۰)

عصمت نے اس خاکے میں سماجی اور سیاسی محرومیوں کا ذکر کر کے دراصل عوام الناس کے اذہان کو جھنجھوڑا ہے اور انھیں باور کرایا ہے کہ اگر وہ اپنی زندگی کو خوبصورت اور خوشحال بنانا چاہتے ہیں تو انھیں لغویات کو ترک کرنا ہوگا اور ایسے سماجی امور سے جو محض ہماری صرف معاشی ترقی اور خوشگوار زندگی کی ضامن ہوں اسے فروغ دینا ہوگا۔ تب ایک شائستہ سماج کی تعمیر و تشکیل ممکن ہو سکے گی۔

بہر حال عصمت نے سجاد ظہیر کی محض اب تک سرسری ملاقاتیں ہوتی رہیں، لیکن باضابطہ اور بھرپور ملاقات اس وقت ہوئی جب لکھنؤ میں ترقی پسند تحریک کا نفرنس منعقد ہوئی۔ عصمت کا قیام سجاد ظہیر کی آبائی کوٹھی پر ہوا۔ دورانِ قیام انھوں نے بنے بھائی کی خانگی زندگی کے نشیب و فراز اور ذہنی و فکری کرب و اضطراب کا بڑی گہرائی سے مطالعہ و مشاہدہ کیا۔ عصمت کے تاثرات ملاحظہ ہوں:

'' وہاں ان کو پہلی بار میں نے بنے بھائی کا بحیثیت ایک انسان مطالعہ کیا۔ بنے بھائی اپنی خاندانی کوٹھی کے پچھواڑے نوکروں کے کواٹروں میں رہتے تھے۔ صحن کے لئے دیوار اٹھی ہوئی تھی کمرے پرانے اور بوسیدہ تھے ایک بڑے سے کمرے میں کئی پلنگ پڑے ہوئے تھے۔ سخت جاڑے پڑ رہے تھے اور ہم سب وہاں ساتھ ہی سوتے تھے۔ بنے بھائی کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ رضیہ لکھنؤ کے کرامت حسین اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ ان کی کمائی پر گھر کا خرچ چلتا تھا۔ گھر کو دیکھ کر تنگی ترشی کی زندگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ لحاف نئے نہ سہی مگر تازہ روئی کے اور گرم تھے۔ بڑا مزہ آتا لحافوں میں سب بچیاں گھس آتیں اور بنے بھائی بھی ان کے ساتھ گھس کے بیٹھ جاتے اور خستہ منگ پھلیوں کا دور چلتا رہتا اور زمانہ بھر کی باتیں ہوتی جاتیں۔ اس عسرت میں بھی بنے بھائی نہایت پھلے پھولے نظر آتے تھے۔ ان

کے چہرے پر اپنے ادبی سکون اور اطمینان کی سرخی جھلک آتی تھی۔
دبلے پتلے ۳۵ کے بنے بھائی زیادہ خوش حال نظر آرہے تھے۔ میں
نے کچھ کراچی کا ذکر چھیڑا تو بڑے بھولے پن سے بولے ''ارے
بھائی ہماری تو وہاں بڑی خاطر مدارات کی گئی میں نے کہا کچھ مارا پیٹا
نہیں'' بولے توبہ کرو بخدا ارے انگلی تک نہیں چھوائی۔ ارے بھئی ہم
نے کچھ کہا بھی تو نہیں تھا۔ یونہی بھول چوک میں پکڑ لیا تھا۔'' (۳۱)

سجاد ظہیر چونکہ ترقی پسند تحریک کے موجد اور سرگرم رکن تھے چنانچہ ان کے گھر میں تحریک کی بابت بحث ومباحثہ شب و روز کا مشغلہ بن چکا تھا۔ بالخصوص علم و ادب اور سیاست و اقتصادیات کے موضوع زیر بحث ہوا کرتے۔ ان کا گھر اس لحاظ سے ادبی ماحول اور تحریکی سرگرمیوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ملک کے معروف شعراء و ادباء سے ہمہ وقت گوناگوں مسائل پر گفتگو کا لامتناہی سلسلہ جاری رہتا۔

بنے بھائی کے گھر کا ماحول عصمت چغتائی کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

''بنے بھائی انتہائی سادگی پسند تھے۔ میز پر کھانے کے بعد وہیں کہیں
ادبی مسئلہ چھیڑ بیٹھتے رکابیاں سرکا کر کتابیں کھول لیتے خشک میوہ کھاتے
جاتے حافظ اور میر پر تبصرہ کرتے جاتے اتنے میں سردار اور مجاز بھی
آجاتے ظ انصاری اور نیاز حیدر بھی وہیں اسٹول کرسیاں کھینچ کر بیٹھ
جاتے یہاں تک کہ چائے کا وقت ہو جاتا۔ بحثیں چلتی رہتیں جملے
چھٹتے رہتے کبھی فرمائش پر کوئی اپنا کلام سنانے لگتا۔ مجاز بھی آجاتے
اور باقاعدہ مشاعرہ ہو جاتا۔ کبھی کسی کی کہنی لگ جانے سے چائے
چھلک کر کسی کتاب کو تر کر دیتی اور رضیہ بڑبڑانے لگتی یہ مشاعرے اور
مباحثے عام طور پر اصل کانفرنس سے دلچسپ ثابت ہوتے۔'' (۳۲)

عصمت اس سلسلہ میں مزید لکھتی ہیں:

''اس کے بعد بھی کئی بار میرا لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا انھیں کے یہاں
قیام رہا۔ بنے بھائی اور ادیبوں شاعروں کو جمع کر لیتے اور رات گئے

تک سلسلہ چلتا رہتا۔ دیکھنے میں بڑے خاموش سے نظر آتے تھے
لیکن بے تکان گھنٹوں باتیں کر لیتے تھے۔ بچوں کی شرارتوں سے
لے کر بڑے بڑے ملک کے رہنماؤں تک بالکل ایک ہی دلچسپی اور
انہماک سے ان سے باتیں کرتے وقت قطعی یہ احساس نہ ہوتا کہ کسی
اہم مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے۔ ذرا بھی دماغ پر زور نہ پڑتا ایک لمحہ کو
طبیعت بور نہ ہوتی بس دماغ کے سارے روزن کھل جاتے اور تازہ
ہوا اور روشنی آنے لگتی۔'' (۳۳)

سجاد ظہیر اکثر و بیشتر تحریک کے سلسلے میں متعدد شہروں اور قصبوں کا دورہ کر کے تحریکی سرگرمیوں سے لوگوں کو روشناس کراتے رہتے۔ اس سلسلہ میں جب بمبئی آتے تو ان کا قیام عصمت چغتائی کے ہاں ہوتا۔ بمبئی میں سجاد ظہیر کی مصروفیات پر تبصرہ کرتے ہوئے عصمت چغتائی لکھتی ہیں:

''بمبئی بھی ان کا اکثر آنا ہوتا رہتا تھا۔ بار بار میرے ہاں قیام کیا وہی
دھیمی دھیمی انداز گفتگو کبھی لوگ جمع ہو جاتے پینے پلانے کا شغل
شروع ہو جاتا۔ بنے بھائی کو مدہوش اور حواس باختہ دیکھنے کا دل میں
ارمان بھی رہ گیا۔ کبھی دو منچلے آپس میں کسی سیاسی یا علمی مسئلے پر الجھ
پڑتے نہ جانے کیسے بھولے بھولے بنے بھائی انھیں ٹھنڈا کر دیتے۔
نہ چہرے پر شکن آتی نہ زبان میں میں نے کبھی تلخی محسوس کی۔ میں
نے کبھی انھیں غصہ میں نہیں دیکھا۔ بڑے غصہ کی بات بھی بڑی
نرمی سے کرتے۔ ان میں بے جا انکساری کی عادت نہ تھی ہمیشہ
بادشاہوں کی طرح ہم کہہ کر بات کرتے تھے ان کے بمبئی آنے سے
ایک عجیب رنگ چھا جاتا۔ جنھیں بمبئی رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے
سے ملنے جلنے کی فرصت نہ ہوتی وہ سب ایک ساتھ جمع ہو جاتے جیسے
کوئی شادی بیاہ ہو رہا ہو ہم سب کو ایک ساتھ جمع رکھنے اور رشتہ قائم
رکھنے میں بنے بھائی کے وجود کو بڑا دخل تھا۔ ان کے آنے سے دلوں

کی کدورتیں بھلادی جاتیں۔ شکایتیں مٹ جاتیں اور سب مل جل
کر ہنس بول لیتے۔" (۳۴)

عصمت نے اس اسکیچ میں سجاد ظہیر کے عادات واطوار اور ادبی وسیاسی سرگرمیوں کے علاوہ ان کی زندگی کے کچھ تاریک پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ سجاد ظہیر کی شخصیت اور ان کے اندازِ گفتار کو قلم بند کرتے ہوئے عصمت یوں بیان کرتی ہیں:

"ان کی طبیعت میں حقیقت پسندی اور رومان کا ایک حسین امتزاج تھا۔ ان کی چال ڈھال میں شہزادگی تھی اور چہرہ پر پیغمبرانہ نور وہ ایک پیارے دوست مشفق صلاح کار اور مکمل رہ نما تھے۔ ان کی آواز انسان کو اپنی خود ضمیر کی آواز لگتی تھی۔ بنّے بھائی ایک مکمل انسان تھے ان کی خامیاں بڑی پیاری تھیں اور کسی کے دل پر زخم نہیں چھوڑ گئیں مجھے نہیں معلوم کہ وہ خامیاں کیا تھیں۔ کبھی بڑی نرم آواز میں کہا کرتے تھے۔" بھئی ہم بڑے معمولی انسان ہیں ہم نے زندگی میں کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا تم لوگوں نے ہمیں یونہی چڑھا دیا ہے۔ میں ان سے کہا کرتی تو آپ کا خیال ہے ہم لوگ احمق ہیں۔ احمق تو نہیں مگر کسی غلط فہمی میں ضرور مبتلا ہو میں کہتی آپ نہیں جانتے مگر آپ نے کچھ دروازے کھولے ہیں کھڑکیاں توڑی ہیں۔ راستے دکھائے ہیں کیا یہ تخلیق نہیں" "تم بہت الٹی بحث کرتی ہو وہ بڑے خوفزدہ ہو کر کہتے اور آپ بڑا رجعت پسند جھوٹ بول رہے ہیں" مگر وہ برابر اپنی میٹھی میٹھی پر اثر آواز میں مجھے قائل کرتے کہ انھوں نے زندگی میں کچھ نہ کیا اور حقیقت ہے۔ خواب دیکھنے والا پل بھر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ ان خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک عمر کا عرصہ بہت ناکافی پڑتا ہے۔" (۳۵)

عصمت سجاد ظہیر کی ادبی تخلیقات کو اردو ادب کا غیر معمولی تحفہ قرار دیتی ہیں اور اس امر کا احساس دلاتی ہیں کہ انھوں نے جو خواب دیکھے یقیناً وہ کچھ نہ کچھ سچائی میں تبدیل

ہوئے اور وہ ادبی و سماجی انقلاب کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ شاید انھیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ ان کے کارہائے نمایاں عصر حاضر کے بنی نوع انساں کی خاطر مشعل راہ ثابت ہوں گے۔ عصمت سجاد ظہیر کے تخلیقی افکار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''بنے بھائی ساری عمر روشن اور جگمگاتے ہوئے خواب دیکھے کتنے بھی ادھورے اور دھندلے رہ گئے۔ وہ ادیب بھی تھے اور شاعر بھی مگر ان کو مطلق احساس نہ تھا کہ ان کا ناول ''لندن کی ایک رات'' اپنا ایک واجب مقام رکھتی ہے اور وہ خطوط جو انھوں نے رضیہ کو لکھے ان میں انھوں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ شاید رضیہ نے ان خطوں ہی کے سہارے زندگی کی تلخیوں کو اس خوبصورتی سے جھیلا یہ خط انھوں نے صرف اپنی پیاری بیوی کو لکھے ہیں مگر دنیا کے ضمیر سے خطاب کیا ہے''۔(۳۶)

''کچھ میری یادیں'' اردو خاکہ نگاری میں اپنی منفرد اسٹائل کی بنا پر امتیازی مقام کا حامل ہے۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) جو اردو ادب کی مایہ ناز اور قابل احترام شخصیت ہیں یہ خاکہ ان سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ بالعموم اردو ادب اس عہد میں سماج کے مختلف النوع موضوعات جیسے نیتاجی، والدین، قرض مہنگائی، چور بازاری، نفع خوری، اقربا پروری، لڑکے لڑکیوں کی بے راہ روی وغیرہ طنز و ظرافت کے ہدف بنتے رہے، لیکن بخاری صاحب کی طنز و ظرافت ان روایتی اور بندھے ٹکے تفنن طبع کے موضوعات سے یکسر مختلف اور بے نیاز ہوتے۔ ان کی ظرافت میں ادبی چاشنی جابجا موجود ہے اور موضوعات کا تعین منفرد ہوتا ہے۔ وہ قاری اور سامع کے روبرو اپنی تحریروں اور تقریروں میں لطائف کی پیوندکاری سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان کی ظرافت زندہ دلی اور متحرک زندگی کی علامت ہے۔ انھیں ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا کہ بھونڈے اور پھوہڑ طنزیہ فقرے قاری کے ذہن و شعور پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں اور اس سے ادب کو کاری ضرب لگتی ہے یہ ظرافت کے میدان میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں ان کے مضامین ایسے نہیں جنھیں عہد حاضر کے ناقدین صرف نظر کر دیں بلکہ مضامین پطرس کو عصر حاضر کے ادب میں عظیم مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ غالباً یہی

سبب ہے کہ عصمت جیسی بے باک ادیبہ بھی مضامین پطرس کا مطالعہ کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ پطرس کی تحریروں کی دلدادہ عصمت نے ان پر ایک خاکہ جو پطرس سے ملاقات کے تعلق سے منسوب ہے رقم کر دیا۔ ہر چند یہ اسکیچ پطرس بخاری کی شخصیت، عادات و گفتار کی مجموعی عکاسی نہیں کرتا اور نہ ہی فنِ خاکہ نگاری کے خط و خال کی تکمیل کرتا ہے۔ یہ بس ایک ملاقات ہے اور کچھ بھی نہیں، لیکن عصمت نے اس ملاقاتی مضمون کو خاکہ قرار دیا ہے۔'' کچھ میری یادیں'' فی الحقیقت عصمت اور پطرس کی شخصیت اور ان کے فنی شعور کے چند پہلوؤں پر سیر حاصل بحث و تکرار ہے جس سے دونوں کی ادبی قد و قامت متعین ہوتی ہے، لیکن اس ملاقات کا اہم موضوع پطرس کے وہ مضامین ہیں جنھیں مزاح نگاری کا بہترین مرقع تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس خاکہ میں عصمت نے یہ بتایا ہے کہ میرے علاوہ گھر کے بھی افراد مضامین پطرس کے دلدادہ تھے، لیکن میرا حال تو یہ تھا کہ کیسے اور کس طرح پطرس سے ملاقات کروں یہ اضطرابی کیفیت برسوں سے میرے دل میں جاگزیں تھیں۔ دراصل عصمت یہ چاہتی تھیں کہ کیوں نہ مزاح نگاری کی دنیا میں دھوم مچانے والے اس فن کار کا دیدار کر کے مزاح کے فن اور اس کے اساسی پہلوؤں پر گفتگو ہو بلکہ مستقبل کے لئے فن مزاح نگاری کو وسعت دینے اور اس کی روایتی بنیاد کو یکسر تبدیل کر کے ایسے موضوعات شامل کر دیے جائیں جن سے سماج کی خامیوں اور حیات انسانی کے متقاضی پہلوؤں میں عہدِ حاضر کی عکاسی کا صاف صاف عکس نمایاں ہو اور دیگر نثری اصناف کی مانند مزاح نگاری میں جدید خیالات و افکار کو مناسب مقام مل سکے۔ عصمت اس ملاقات سے دراصل ہمیں یہ بتانا چاہتی ہیں کہ فن اور شخصیت دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں جب فن میں نکھار آئے گا تو از خود شخصیت نکھر جائے گی۔ چاہے افسانہ نگاری کا میدان ہو یا ناول نگاری کا، ڈراما نگاری کا فن ہو یا ظرافت نگاری کا بشرطیکہ ہم ادب کے متقاضی آداب و قواعد کو ملحوظ رکھ کر فن کی تعمیر کریں اور اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ صنف کوئی بھی ہو عصر حاضر کے سماجی شعور کی ضرور نمائندگی کرے وگرنہ قلم کار کی ساری محنت ضائع ہو جائے گی بالخصوص مزاح نگاری میں تو اس کی نمائندگی بے حد ضروری ہے۔ صرف طنز و تشنیع کو بنیاد بنا کر مزاح نگاری کو محض مخصوص حلقہ تک محدود نہیں رکھنا چاہئے بلکہ ظرافت اور فقرہ بندی کا براہ راست رشتہ عام انسانوں سے

ہونا چاہئے چونکہ کوئی بھی فن پارہ سماجیات کے بغیر ادھورا ہے اور جب ایسا ہوگا تو ادب کا متاثر ہونا لازم ہے۔ اس لئے طنز و مزاح کے فن میں عوامی معاملات اور تقاضے کا ہونا اہم ہے۔ عصمت نے دراصل اس ملاقاتی خاکہ کے ذریعہ فن مزاح نگاری کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی خواہش مند ہیں لیکن گفتگو کا محور و مرکز محض مزاحیہ نگاری کے فن تک محدود نہ ہو بلکہ ادب کے دیگر نثری اصناف پر بھی کھلی فضا میں بحث کی جائے۔

بہر حال اس خاکہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عصمت نہ صرف ادب اور سماج کے متقاضی پہلوؤں پر گفتگو کی خواہاں ہیں بلکہ ان کی پطرس سے ملنے کی دیرینہ خواہش بھی ظاہر ہوتی ہے۔ پطرس اس زمانہ میں آل انڈیا ریڈیو کے اعلیٰ و باوقار عہدہ پر فائز تھے اور اتفاق سے بمبئی اپنے کسی سرکاری دورے کے تحت تشریف فرما تھے۔ ایک روز ریڈیو اسٹیشن سے فون آیا کہ پطرس صاحب آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں اور ساتھ ہی شاہد لطیف یعنی آپ کے شوہر کو بھی یاد فرمایا ہے۔ اس فون کے بعد عصمت کو پطرس سے ملنے کا اشتیاق جوش مارنے لگا۔ اور طرح طرح کے خیالات ان کو ستانے لگے۔ کبھی خود پر اور کبھی پطرس کی بابت غور و خوض کرتیں حتیٰ کہ وہ پوری طرح سے احساس کمتری کا شکار ہو جاتیں بقول عصمت:

"وہ مجھے قطعی قابل ملاقات سمجھتے ہیں جب ہی تو بلایا ہے" (۳۷)

یوں تو پطرس صاحب عصمت کے فن اور شخصیت سے کما حقہ واقف تھے کیونکہ انھوں نے صدیوں پرانی تاریک راہوں کو ترک کر کے اپنی منفرد راہ از خود منور کی اور افسانوی ادب کو تغیراتِ زمانہ کے متقاضی پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ اس لئے عصمت کے اس کارہائے نمایاں کو فراموش کرنا گویا ان کی شخصیت اور فن سے بے انصافی ہوگی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پطرس صاحب اپنے ایک مضمون " کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں " خود اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "......... عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے، انھوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیے ہیں کہ جب تک وہ کھڑی تھیں کئی راستے آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اس کارنامے کے لئے اردو خزانوں ہی کو نہیں اردو کے ادیبوں کو بھی ان کا ممنون

ہونا چاہئے۔" (۳۸)

بہر کیف عصمت نے ریڈیو اسٹیشن جانے کا عزم مصمم کرلیا اور جہاں تک شاہد لطیف کا سوال ہے تو انھیں کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔ پطرس صاحب کی قد آور شخصیت سے مرعوب عصمت کو مختلف النوع خیالات وافکار مسلسل تعاقب کرنے لگے۔ کبھی وہ گفتگو کے سلسلہ میں آداب واحترام کو ملحوظ رکھنے کی بابت غور وخوض کرتیں تو کبھی ادب پر ممکنہ مباحث پر سنجیدہ ہوتیں تو کبھی یہ خیال آتا کہ ان سے نہ ملوں۔ یہ تمام چیزیں ان کے ذہن وشعور میں بیک وقت مچل رہی تھیں حتیٰ کہ کرب واضطراب کے عالم میں ساری رات بے خوابی میں گزار دی۔

رفتہ رفتہ وہ وقت آ گیا جس کے لئے وہ فون کے بعد نفسیاتی اور اعصابی تناؤ میں مبتلا تھیں۔ عصمت ریڈیو اسٹیشن پہنچیں جہاں ایک کمرے میں میز پر لگی ہوئی اونچی فائلوں کے درمیان پطرس صاحب براجمان تھے۔ عصمت کو دیکھ کر پطرس صاحب نے زوردار استقبال کیا اور دونوں نے ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کی بعد ازاں دونوں ہوٹل تاج تشریف لے گئے جہاں آپس میں ادبی، سماجی اور تہذیبی نکات پر گرما گرم بحث وتکرار کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ گو کہ پطرس صاحب مباحثہ کے تئیں قبل از وقت سنجیدہ اور اپنی مکمل تیاری کے ساتھ ان کے روبرو حاضر تھے۔ تاہم عصمت جیسی بے باک ادیبہ سے بہر حال خوف زدہ ہوتے ہوئے بھی عصمت کے سوالوں کے جوابات پطرس بڑی بے دلی اور بے اعتنائی سے دیتے رہے۔ جس سے عصمت کے مزاج میں غیر معمولی اشتعال رونما ہوتا رہا۔ عصمت کو پطرس کے اس بداخلاقی رویے سے بڑی مایوسی ہوئی پھر بھی خاموشی سے انھیں جھیلتی رہیں، لیکن کبھی کبھی عصمت کا صبر واستقلال کا پیمانہ لبریز ہو جاتا جسے پطرس صاحب بھی جو مزاجاً نازک طبع اور نفاست پسند تھے برداشت کرنے کے لئے مجبور ہوتے۔ عصمت کو جو بات سب سے زیادہ معیوب لگتی وہ پطرس صاحب کا انداز گفتار جوان کے خیال میں انتہائی بھونڈے پن کا شکار ہوتا۔ عصمت لکھتی ہیں:

"......... میرے ہر ذہین اور دقیق سوال کے جواب میں نہایت بھونڈے پن سے ہٹائے بھی یہ بورنگ باتیں۔" کہہ کر انھوں نے میرا خوب جی جلایا۔" (۳۹)

آخر کار اس طویل بحث و تکرار اور نوک جھونک کے درمیان پطرس کے سامنے عصمت کی انانیت اور خود پسندی نے دم توڑ دیا۔ خوش فہمی میں مبتلا عصمت دراصل پطرس کی فطری حالت و کیفیت سے بخوبی واقف نہ تھیں اور متواتر ان سے خفت و ہزیمت کا تیر و تفنگ سہتی رہیں۔ پطرس جو شخصیت اور فن کے اعتبار سے دیوزاد تھے اور ذی علم اور ذی شعور طبقہ ان کی قد و قامت کا معترف تھا اور عصمت کو اس کا چنداں احساس نہیں کہ میری ملاقات ایک جید عالم اور فنون لطیفہ کے شائق کے درمیان ہے لیکن یہ سچ ہے کہ ان کی بے باک فطرت نے بار باران ہی کو نادم کیا۔ مگر وہ شکست خوردہ سپاہی کی مانند پطرس کو پیٹھ نہیں دکھائی بلکہ ان کے جملہ سوالوں کا برملا اور مدلل جواب دیتی رہیں۔ ہر چند کہ ان جوابوں کے مابین ان کی جھلاّہٹ جا بجا آشکار ہوتی رہی، لیکن پطرس جیسا متحمل انسان ان کی تلخ کلامی اور ترش مزاجی سے دل برداشتہ نہ ہوا بلکہ انتہائی دل جمعی کے ساتھ اور مستقل مزاجی سے ان کا سامنا کرتا رہا۔

درآں حالیکہ عصمت کو پطرس کے ساتھ کیے گئے منفی رویے پر بے حد افسوس تھا۔ کیونکہ ان کی تعریف و توصیف میں عصمت نے کوئی ایسی بات دورانِ گفتگو نہیں کہی جب کہ عصمت پطرس کی تحریروں کی غیر معمولی مداح تھیں بقول عصمت:

> ''میں نے ان سے یہ بھی نہیں کہا کہ میں کب سے اور کتنی ان کی مختصر سی تحریروں کی مداح ہوں۔ میں نے بہت کم ان کی تعریف کی۔ جو کہا وہ نہایت بے رخی سے سنی ان سنی کر گئے۔'' (۴۰)

پطرس صاحب جب عصمت کے مسلسل منفی رویے سے بالکل اوب گئے اور ان کی کٹی جلی باتوں سے پریشان ہو گئے تو انھوں نے کچھ لمحہ کے لئے خاموشی اختیار کی گو کہ بحث و مباحثہ کا سلسلہ ابھی منقطع نہیں ہوا تھا بلکہ اس میں مزید شدت آ گئی تھی اور نئے نئے موضوعات جو برسوں سے بحث طلب تھے سر اٹھانے کے لئے مضطرب تھے۔ لگتا تھا جیسے دورانِ ملاقات ادب برنہیں جنگ کے موضوع پر بحث چل رہی ہو۔ عصمت عجلت پسند طبیعت کی مالک تھیں اور فوراً اپنی باتوں کو ختم کرنے میں عافیت محسوس کرتیں۔ عصمت نے سمجھا کہ اب پطرس خاموش ہو گئے اور ان کے پاس ایسا کوئی موضوع باقی نہیں جو لائق بحث ہو، لیکن ان کی خاموشی کا مطلب کچھ اور ہی تھا یعنی ذہنی تکان کو دور کرنے کے لئے کافی وغیرہ

کے خواہش مند تھے۔ پطرس نے ہوٹل کے بیرا کو آواز دی جب بیرا ان کے قریب آیا تو پطرس اور بیرا کے درمیان ہونے والی گفتگو عصمت کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''کافی ——''

''کافی ——؟'' بیرا چکرایا ——

''ہاں نمکین بسکٹ بھی'' —— بیرا مجسم سوال بنا کبھی مجھے اور کبھی انھیں دیکھنے لگا۔

''کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے —— شاباش ——''

''نہیں صاحب اطمینان رکھو'' —— بھونچکا سا بیرا کافی لینے چلا گیا۔'' (۴۱)

اگرچہ یہ ایک ملاقات ہے جسے عصمت نے ماضی کی یادوں کو ترتیب دے کر خاکے کا نام دے دیا ہے۔ بلاشبہ عصمت ایک فنکار ہیں اور دنیائے ادب میں ان کا نام بالخصوص افسانوی تخلیقات میں صفِ اول میں شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی شوخ نظروں سے سماج کے نادر ونایاب مسائل کو اپنے نوکِ قلم کے ذریعہ صفحۂ قرطاس پر بکھیرے ہیں جو عام انسانوں کی دسترس اور معلومات سے مفقود تھے۔ بھلا ایسا فنکار جو سماجی امور میں بلا کی صلاحیت کا حامل ہو، اس کے نزدیک ایک ملاقاتی مضمون کو خاکے کے قالب میں ڈھال دینا کوئی بڑی بات نہیں، لیکن انھوں نے فن خاکہ نگاری کا ایک اہم جز و جو خاکے کی مرکزیت کہلاتی ہے یعنی شخصیت نگاری جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا، عصمت نے پطرس کی شخصیت پر محض طائرانہ نظر ڈالی ہے جو پطرس جیسے قد آور فنکار کے لئے غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بحیثیت مجموعی اس امر سے انکار محال ہے کہ تاج ہوٹل بمبئی میں پطرس اور عصمت کے درمیان ہونے والی گفتگو نے اپنا مثبت اثر مرتب کیا ہے کیونکہ یہ ملاقات دو اہم ادبی شخصیتوں کے درمیان ہوئی تھی اور بہت سے ایسے امور زیر بحث آئے جو میرا خیال ہے کہ دونوں کے علم ودانش میں نہیں تھے بلکہ دونوں کے باہمی بحث ومباحثہ اور تبادلۂ خیالات کے ذریعہ طشت ازبام ہوئے۔ خواہ وہ ادبی ہوں یا غیر ادبی پطرس جیسی عظیم شخصیت کے لئے بھی یہ مکالمہ آرائی ایک نیا تجربہ ثابت ہوئی ہوگی۔ بلاشبہ دونوں ادبی شخصیتیں اس گفتگو کے حوالے سے قارئین کو گویا یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ ان کے نزدیک عصمت اور پطرس کے متعلق جو برسوں سے غلط فہمیاں تھیں اس ملاقات سے دور ہو گئیں۔

یقیناً ''کچھ میری یادیں'' نے ایک نئی روش کو جنم دیا ہے جو اردو خاکہ نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

بظاہر خاکے تنقیدی عناصر سے معرا ہوتے ہیں لیکن عصمت نے جو خاکے لکھے ہیں، ان سے ان کی تنقیدی بصیرت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ وہ چند بے باک جملوں سے اپنے موضوع کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کر دیتی ہیں۔

☆☆

باب سوم

عصمت چغتائی کی رپورتاژ نگاری

وہ رپورٹ جو ادبی چاشنی سے ہم آہنگ ہو کر تحریر کا جامہ پہن لے اسے رپورتاژ کہتے ہیں۔اس کی خصوصیت یہ ہے کہ پڑھنے والا واقعات میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے وہ کوئی رپورٹ ہے یا افسانے اور ناول کا اقتباس۔اردو میں رپورتاژ کے بانی سجاد ظہیر ہیں جنھوں نے ''یادیں'' لکھا۔ شاید اس کے بعد اس صنف میں طبع آزمائی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بہت سارے ادیبوں نے رپورتاژ لکھ کر اس صنف کو آگے بڑھایا۔جیسے کرشن چندر نے ''پودے'' عادل رشید نے ''خزاں کے پھول'' تاجور سامری نے ''جب بندھن ٹوٹے''، قدرت اللہ شہاب نے ''یا خدا'' پرکاش پنڈت نے ''کہت کبیر سنو بھائی سادھو''، رضیہ سجاد ظہیر نے ''امن کا کارواں''، زہرہ جمال نے ''پندرہ ستمبر کی رات'' اور عصمت چغتائی نے ''بمبئی سے بھوپال تک۔''

''بمبئی سے بھوپال تک میں'' عصمت چغتائی نے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ بھوپال کا ذکر کیا ہے۔بمبئی سے بھوپال تک ٹرین کے دلچسپ سفر، کانفرنس کے احوال اور وہاں سے واپسی کی روداد کو انھوں نے نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔اس کانفرنس میں عصمت کے علاوہ اور جو دیگر ترقی پسند مصنفین ان کے رفیق سفر تھے ان میں چند کے نام یہ ہیں کرشن چندر، مہندر ناتھ، شاہد لطیف، مجروح سلطانپوری اور عادل رشید، عصمت چغتائی کی بچی سیما اور عادل رشید کی بچی بھی ان نامور مصنفین کے قافلہ میں شریک تھیں۔راہبر کے فرائض کرشن چندر انجام دے رہے تھے۔ان تمام لوگوں نے بمبئی سے بھوپال جانے کے لئے ٹرین کے سفر کو ترجیح دیا اور چل پڑے سفر طویل تھا۔اس بوریت کو کم کرنے کے لئے کچھ لوگوں نے آپس میں رمی کھیلنا شروع کیا۔گاہے گاہے آپسی بحث و مباحثہ کا بازار بھی گرم ہوتا رہا۔ہنسی مذاق کا دور بھی چلتا رہا اور اس طرح طویل اور اکتا دینے والا تکلیف دہ سفر آرام کے ساتھ طے ہوا۔بھوپال پہنچ کر لوگوں نے ایک دن آرام کیا دوسرے روز کانفرنس شروع ہوئی جو منٹو ہال میں تھی۔کانفرنس میں مردوں اور عورتوں کا ایک انبوہ موجود تھا۔کانفرنس کے پہلے اجلاس کی صدارت کرشن چندر نے کی۔ان کی ''نثری شاعری''

نے لوگوں کو ان کا گرویدہ بنا دیا بقول عصمت:

''.........کرشن جوتا بھی مارتا ہے تو شاعری میں لپیٹ کر اور یہی وجہ ہے کہ ضرب گہری پڑتی ہے مگر نشان نہیں پڑتا۔''(۱)

دوسرے روز شاہد لطیف نے جلسے کی صدارت کی اسی روز ظفر صاحب نے اپنا ایک ڈراما پڑھ کر سنایا اور عصمت چغتائی نے اپنی ایک کہانی سنائی۔ اس کے بعد سندر لال جی کی صدارت میں ترقی پسند مصنفین کانفرنس کا اجلاس بڑا ہی زوردار رہا۔ انھوں نے اجلاس کے آخر میں اپنی صدارتی تقریر پیش کی۔ تقریر کیا تھی شعلہ سا لپک جائے والی کیفیت تھی بہرحال اجلاس بڑا ہی کامیاب رہا۔ ان کی تقریر کے انداز کو بیان کرتے ہوئے عصمت چغتائی لکھتی ہیں:

''.........انھیں مائیکروفون کی تو ضرورت نہ تھی۔ ہال کا کونہ کونہ ان کی خطیبانہ للکار سے گونج رہا تھا۔ مجھے تو بس اس بات پر رشک آ رہا تھا کہ وہ خطبۂ صدارت لکھنے کے بجائے بول رہے تھے۔ موضوع ''اردو زبان کی حمایت'' تھا لیکن وہ تو چوکھی رسید کر رہے تھے۔ کبھی دو ہاتھ سیاست کے، کبھی اقتصادیات، کبھی ایک آدھ جھانپڑ مذہب کے بھی رسید کر دیتے تھے۔ پھر ہندو مسلمان دونوں کو بھگو بھگو کر رسید کیا.........بیچ بیچ میں حسب موقع جیل خانوں اور ان کے مالکوں کی ٹانگ گھسیٹ ڈالی۔ دو چار پٹخنیاں اکھنڈ ہندی اور اردو کو بھی دے ڈالیں۔ سوائے کھانے پکانے اور سینے پرونے کے نسخوں کے دنیا کے ہر پہلو کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔''(۲)

اس کے بعد خود عصمت نے تقریر کی تھی۔ وہ لکھتی ہیں:

''اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی۔ خدا کی پناہ۔ یہ بھیڑ ہے یا میری آنکھوں کو ایک ایک کے چار نظر آ رہے ہیں۔ جدھر دیکھو انسانوں کے چہرے۔ آج زنانخانے کو گھسیٹ کر بہت دور کونے میں رکھ دیا گیا تھا۔ مائیکروفون ٹھپ پڑا تھا۔ مگر جاں نثار اختر منہ میں ٹھونسے دیتے تھے۔ چونکہ وہ اس کا کرایہ دے چکے تھے لہٰذا بقول کسے خان اپنا مال

کھا ہی نہیں رہا تھا بلکہ دوسروں کو بھی کھلا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مائیکروفون گلا دبوچ لیتا ہے۔ ایک بار آواز کو نگل لیتا ہے اور پھر بڑھا کر اگلنے کے بجائے ڈکار جاتا ہے۔ ہال میں برابر کانا پھوسی ہو رہی تھی۔ پردے کے پیچھے سے بیویاں کھُسر پھُسر کر رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے پرچہ ختم ہوا۔" (۳)

اس کے بعد دوسرے اجلاس میں ایک ڈراما پیش کیا گیا جو کسی کے پلّے نہیں پڑا۔ ڈراما پر تبصرہ کرتے ہوئے عصمت کی تحریر میں ملاحظہ ہو:

"............کسی کو اپنا پارٹ یاد نہ تھا۔ پرومپٹر کی آواز سب پر غالب تھی۔ ستم ظریفی دیکھئے۔ وہ لڑکے صاحب جو لڑکی کا پارٹ کر رہے تھے شیو کرنا بھول گئے تھے۔ چوٹی کسی احمق نے اتنی ڈھیلی لٹکائی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب ٹپکی اور جب ٹپکی لڑکیاں تو بیچاری اسی ہول میں مری جا رہی تھیں کہ ڈراپ سین ہونے سے پہلے چوٹی ضرور ٹپک جائے گی، لیکن جب ڈراما بخیر و خوبی چوٹی سمیت انجام پا گیا تو سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اتنی دیر جانو سولی پر لٹکے رہے—
دوسرا لڑکا جس نے لڑکی بننے کی سعی بلیغ فرمائی تھی سینے پر اتنا گودڑ ٹھونس لایا تھا کہ لڑکیاں شرم اور غصے کے مارے بھنائی جا رہی تھیں۔ دو ایک نے آ کر مجھ سے شکایت کی۔ "دیکھئے تو کیسا عورت کا ہیولی بنا کر مذاق اڑایا جا رہا ہے۔" (۴)

ڈراما ختم ہونے کے بعد عصمت کو تمام لڑکیوں نے گھیر لیا کچھ دیر عورتوں اور لڑکیوں کے مسائل پر آپس میں تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ پردہ اور عورت کی آزادی اور ان کے ساتھ مردوں کی زیادتیاں موضوع گفتگو رہے۔ ہال کے باہر کرشن چندر کو بہت سارے طالب علموں نے گھیرے میں لے لیا تھا اور وہ انھیں کچھ سمجھا رہے تھے۔

تیسرے روز جلسے کی صدارت مہندر ناتھ نے کی۔ ان کے خطبۂ صدارت کو مردوں کے بہ نسبت عورتوں نے زیادہ پسند کیا۔ مجمع میں خواتین کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ خطبۂ صدارت

کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ جوشؔ صاحب جو لکھنؤ سے آئے تھے اس مشاعرہ میں ان کی شرکت ہی بہت کافی تھی۔ ان کے علاوہ مشاعرہ میں مجروحؔ سلطانپوری اور غلام ربانی تاباںؔ بھی موجود تھے۔ جوشؔ صاحب کے مشاعرہ گاہ پہنچتے ہی شاعر انقلاب زندہ باد کے نعرہ سے سارا ہال گونج اٹھا۔ جب جوشؔ ملیح آبادی اسٹیج پر مسند نشین ہوئے تو ان کے گلے میں ہار پہنائے گئے۔ اس وقت ہال میں تالیوں اور نعروں کی وہ گونج اٹھی کہ بچے دہل گئے اور رونے لگے۔ جوشؔ صاحب کے آجانے سے مشاعرہ کی رونق بڑھ گئی۔ لیکن کچھ تشنگی سی محسوس کی جارہی تھی۔ کیونکہ جوشؔ کے ساتھ مجازؔ اور ساحرؔ بھی آنے والے تھے۔ وہ کسی وجہ سے نہیں آسکے تھے۔ خیر کسی طرح مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔ اس سلسلہ میں عصمت لکھتی ہیں؛

"..........جوشؔ صاحب بڑے موڈ میں تھے اور ڈانٹ کر سب سے داد لے رہے تھے۔"(۵)

دوسرے روز شام کو سانچی کے استوپ دیکھنے کا پروگرام بنا۔ ساتھ میں جوشؔ مع جاں نثار اخترؔ اور عسکری کے اس قافلے میں شامل تھے۔ ایک لاری میں سب لوگ بیٹھ کر چلے۔ لاری کے متعلق عصمت چغتائی لکھتی ہیں:

"ہم کسی معمولی لاری میں نہیں جارہے تھے بلکہ ہسپتال سے ایک ایمبولینس مستعار لی گئی تھی۔ کم بخت اس قدر غل مچاتی کھڑکھڑاتی چلتی تھی کہ مردے بھی جاگ پڑتے ہوں گے۔ تین چار میل گئے ہوں گے کہ اس نے ہچکیاں لینا شروع کردیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ مریضوں کی صحبت میں رہ کر کمبخت خود بھی ادھ مری ہوگئی تھی۔"(۶)

آخر کار لوگ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکے اور آدھے راستے ہی سے واپس ہونا پڑا۔

"..........بڑی مشکل سے موٹر رکی اور واپس لوٹائی گئی.......سانچی جانے کا موڈ ختم ہوگیا۔ سب کی یہی رائے ہوئی کہ بخیر و عافیت جلد از جلد گھر پہنچنا چاہئے.......یہ ہوئی سانچی کی سیر۔"(۷)

دوسرے روز یہ لوگ بھوپال سے بمبئی آگئے۔ یہاں آنے کے بعد اطلاع ملی کہ سردار جعفری رہا ہوگئے۔ رپورتاژ کے آخری اقتباس میں عصمت فرماتی ہیں:

''بمبئی آکر معلوم ہوا کہ علی سردار جعفری رہا ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے محکمۂ بالا سے کچھ گھپلا ہو گیا تھا یا شاید بھول چوک ہو گئی۔ بھساول کے ترقی پسند مصنفین کو میرا پیغام ہے کہ آپ کے کہنے کے مطابق ہم نے میدان رجعت پسندوں کے قبضہ میں نہ جانے دیا۔ بات یہ تھی کہ وہاں کوئی سامنے آیا ہی نہیں۔ لہٰذا میدان جیت آئے ہیں۔'' (۸)

''بمبئی سے بھوپال تک'' عصمت کا پہلا رپورتاژ ہے۔ گو کہ انھوں نے اس رپورتاژ کے حوالے سے فن رپورتاژ نگاری میں اپنا پہلا قدم رکھا ہے، لیکن وہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں اپنا مقام قبل از وقت متعین کر چکی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے اس رپورتاژ میں افسانوی ادب کی بوقلمونی جا بجا نظر نواز ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو کوئی معیوب بات نہیں کیونکہ وہ پہلے افسانہ نگار ہیں لہٰذا اس کی چھاپ کا نظر آنا فطری ہے۔ بلکہ افسانوی اندازِ نگارش سے رپورتاژ میں تسلسلِ واقعات اور اس کے بیان نیز یکے بعد دیگرے رونما ہونے والے لمحات بڑے ہی بصیرت افروز انداز میں کرتی ہیں۔ جس سے رپورتاژ میں زندگی کا تازہ احساس جا بجا نظر نواز ہوتا ہے جیسے واقعاتِ سفر اور اجلاس کے انعقاد کے متعدد حوادث جسے ادب کے پرستار متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے بلکہ اگر ہم یہ کہیں تو مضائقہ نہ ہوگا کہ عصمت نے محض اپنی تفنن طبع کی خاطر اس نوزائیدہ صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ تو غلط نہ ہوگا۔ نہ صرف سلسلۂ واقعات، متعدد اجلاس کے نظم و ضبط کو ملحوظ رکھا بلکہ کانفرنس میں شامل معروف اور نامور شخصیتوں کی جو دوران تقریر یا شعر گوئی کی حالت میں اضطرابی اور اعصابی کیفیت نظر آتی ہے اس کی منظر کشی بڑے ہی دلکش انداز میں کی ہے۔ مقررین کا انداز بیان، افسانہ نگار کے اندازِ گفتار اور بالخصوص صدارتی منصب سے سامعین کو خطاب کرنے اور اس سے پیدا شدہ ردعمل کا نفسیاتی الجھنوں اور اس کے پے در پے رعمل کا سلسلہ رپورتاژ کے آخری حصہ تک جاری و ساری رہتا ہے۔ علاوہ ازیں مقررین کی انقلابی اور جنونی کیفیت کی تقاریر سے معمور ماحول کی عکاسی میں شدت پیدا ہونے کا احوال عصمت نے من و عن پیش کر کے دراصل حقیقت نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔

مجموعی طور پر ''بمبئی سے بھوپال تک'' اپنی گونا گوں خوبیوں کی باعث فن رپورتاژ

نگاری کے میدان میں دیگر رپورتاژ کے بالمقابل منفرد مقام کا حامل ہے۔

"یہاں سے وہاں تک" عصمت چغتائی کا دورۂ پاکستان ہے۔ جس میں انھوں نے اپنی مخصوص اسٹائل کے ذریعہ قیام پاکستان کے متعدد واقعات اور مختلف جلسوں، میٹنگوں کا ذکر بڑے ہی دلچسپ پیرائے میں کیا ہے۔ اپنے لواحقین و متعلقین سے لے کر معروف شعراء و ادباء سے ملاقات کے لمحوں کو انتہائی جذباتی انداز میں پیش کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ناشرین جو ان کی کتابوں کو شائع کرتے رہے اور رائلٹی کے نام پر ایک پیسہ بھی انھیں نہیں بھیجا جبکہ شاہد لطیف کے بعد از مرگ وہ اقتصادی بحران سے دوچار تھیں، ان کی شکایت اور اس سے پیدا ردعمل کا اظہار جا بجا ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے اس نوزائیدہ صنف کو اپنے افسانوی زبان و بیان سے اتنا پر کشش بنا دیا ہے کہ قاری کو بوریت کا چنداں احساس نہیں ہوتا۔ اس کے مطالعہ سے ایسا نہیں لگتا کہ یہ ایک روداد ہے بلکہ یہ کوئی افسانہ یا ناول کا باب محسوس ہوتا ہے اور قاری تسلسل واقعات کو یکے بعد دیگرے اپنے قلب و ذہن کے نہاں خانوں میں رفتہ رفتہ مرتسم کرتا جاتا ہے۔

عصمت فی الحقیقت اس رپورتاژ کے ذریعہ یہ تاثر دینا چاہتی ہیں کہ اردو ادب کے بہی خواہوں اور پرستاروں کا کوئی مخصوص ملک یا علاقہ متعین نہیں ہوتا چنانچہ ادب کیسا بھی ہو اس کو سرحدوں میں محصور نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص اردو ادب کے لئے تو یہ مفروضہ کسی لحاظ سے بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اردو ادب غیر منقسم ہندوستان کا مقبول ترین ادب ہے اور اس کے پرستاروں کی تعداد لامحدود ہے۔ عصمت اپنے سفرنامۂ پاکستان سے فی الواقع اس امر کی وضاحت کرنا چاہتی ہیں کہ ادب اور انسانیت کا رشتہ کسی ملک کے سرحدی رشتوں سے زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔ جس میں سیاسی یا سماجی مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

تقسیم ہند کے بعد عصمت چغتائی کے اعزا و اقربا پاکستان چلے گئے۔ بالخصوص ان کے مرحوم شوہر شاہد لطیف کا پورا خاندان پاکستان میں جا بسا۔ صرف عصمت اور ان کی بڑی بہن عظمت ہندوستان میں تھیں۔ اپنے لواحقین سے ملنے کی تڑپ عرصۂ دراز سے تھی مگر وقتاً فوقتاً ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی اور گاہے بگاہے محاذ آرائی کی صورت حال پیدا ہونے کے سبب عصمت سفر پاکستان سے قاصر رہیں، لیکن ایک لمحہ ایسا آیا جب دونوں ملکوں کے مابین خوشگوار ماحول پروان چڑھا اور ماہ ستمبر ۱۹۷۶ء میں آخر کار برسوں کا

خواب شرمندۂ تعبیر ہوا یعنی عصمت بذریعہ طیارہ پاکستان پہنچیں۔ جہاں ایرپورٹ پر منتظر عصمت کے بڑے بھائی مرحوم عظیم بیگ چغتائی کی لڑکی مدحت سعید نے انھیں خوش آمدید کہا۔

بلاشبہ عصمت ہندوستان اور پاکستان میں یکساں طور پر مقبول تھیں۔ پاکستان میں اردو کے شیدائی بھلے ہی ان سے بالمشافہ نہ ملے ہوں مگر ان کے نام اور ادبی تخلیقات سے بخوبی واقف تھے۔ ایرپورٹ سے جب عصمت باہر نکلیں تو اپنے عزیز و اقارب وغیرہ سے انتہائی جذباتی انداز میں ملیں۔ اس منظر سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے عصمت نے اپنی کھوئی ہوئی دولت کو از سر نو حاصل کر لیا ہو۔ مدحت سعید کی رہائش گاہ ہی ان کا مستقل قیام رہا اور وہیں سے وہ اپنے پروگرام طے کرتیں۔

شہر کی ایک تقریب میں معروف شاعر فیض احمد فیضؔ سے ان کی ملاقات عمل میں آئی۔ دونوں عرصۂ دراز کے بعد ایک دوسرے سے ملے۔ ادب اور سیاست پر سیر حاصل بحث ہوئی۔ حتیٰ کہ دورانِ گفتگو فیضؔ صاحب اشعار بھی پڑھتے رہے اور لوگ ان کی شاعری سے محظوظ ہو رہے تھے، لیکن عصمت سے ہندوستانی ادباء و شعراء کی بابت استفسار بھی کرتے رہے۔ اس طرح عصمت اور فیضؔ دونوں آپس میں متعدد امور پر خوب باتیں کی۔

دعوت سے فارغ ہونے کے بعد عصمت سے ملنے والوں کا لامتناہی سلسلہ دیر رات تک جاری رہا۔ صبح ہوتے ہی عصمت سے ملنے کے لئے چند لوگ آئے جس میں ادیب بھی تھے اور شاعر اور انٹرویو کرنے والے مختلف رسائل و جرائد کے مدیر و نامہ نگار شامل تھے۔ عصمت سے جابجا اور جملہ محافل میں جو سوال سب سے زیادہ پوچھا گیا وہ مشہور کہانی کار کرشن چندر کی بابت تھا عصمت لکھتی ہیں:

> ''پاکستان میں میں نے دیکھا کہ ان لوگوں کو جو عقیدت کرشن چندر سے ہے اس کی مثال دنیا میں کم ملے گی۔ جو ملتا تھا ان کے بارے میں سوال کی بھرمار کر دیتا تھا۔'' (۹)

کیونکہ اس زمانہ میں کرشن چندر بستر علالت پر تھے اور کافی دنوں سے علیل چل رہے تھے۔ کرشن چندر کے بہی خواہوں اور مداحوں کی تعداد ہندوستان کے مقابلہ پاکستان میں نہ تھی۔ وہ لاہور کی ادبی محفلوں کے درخشندہ ستارہ تسلیم کئے جاتے تھے۔ کرشن چندر کو لوگ ان کی

ادبی تخلیقات سے کم نجی زندگی سے زیادہ مانوس تھے۔لہٰذا اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے عصمت نے اب یہ منصوبہ بنالیا کہ پہلے کرشن چندر کے متعلق پوچھے گئے سوالات کے جواب دوں گی پھر کوئی اور بات ہوگی۔لیکن اس وقت عصمت حیرت زدہ ہوگئیں جب ایک کرشن چندر کا پرستاران کے روبرو پریشان حال میں آیا۔عصمت کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

''عید کا دن تھا ایک لڑکا بوکھلایا ہوا آیا۔
چودہ میل سے سائکل پر آرہا ہوں۔چودہ گھنٹے گھر ڈھونڈنے میں
بیت گئے۔بس یہ پوچھنا تھا کرشن جی کیسے ہیں؟''
بالکل اچھے ہیں۔''
اس نے شکریہ ادا کیا اور باہر نکل گیا۔''(۱۰)

علاوہ ازیں پاکستانی ادیبوں اور شاعروں نے عصمت سے جو دوسرے اہم سوالات پوچھے وہ اردو زبان وادب اور اس کی ترقی وترویج کے سلسلہ میں تھے۔پاکستان کے ادبی حلقے کا بالعموم خیال یہ تھا کہ ہندوستان میں اردو زبان کے ساتھ سوتیلا برتاؤ ہورہا ہے اور وہ سیاست کا شکار ہوگئی ہے۔عصمت نے کہا کہ آپ لوگوں کا خیال یکسر غلط ہے۔سچ تو یہ ہے کہ اردو زبان وادب کلاسیکی زبان کے قالب میں داخل نہ ہوجائے اس کے لئے حکومت ہند ہمہ وقت کوشاں ہے اور فروغِ اردو کی خاطر متعدد ذرائع ابلاغ خواہ وہ پرنٹ میڈیا ہو یا سمائی میڈیا، اس کی مشتہری کی خاطر سنجیدہ رہی ہے۔سرکاری اشتہار اردو اخبارات ورسائل کے ساتھ ساتھ ٹیلی ویژن جیسے مضبوط ذرائع ابلاغ کو فراہم کرتی رہتی ہے۔مرکز میں فروغ اردو کے لئے کونسل کا قیام اور انجمن ترقی اردو بیورو کا قیام اس بات کی ضمانت ہیں۔ملک کی جملہ ریاستوں میں اسی غرض وغایت کے تحت اردو اکادمیوں کا قیام عمل میں آیا ہے۔ان اکادمیوں کے ذریعہ اردو کے ادباء شعراء کی تخلیقات اور ان کے دیگر اردو فلاحی کارناموں کو شائع کرنے کے لئے انھیں مالی امداد فراہم کی جاتی ہے۔ان کی ادبی خدمات کی حوصلہ افزائی کے عوض انھیں انعامات دیے جاتے ہیں۔اردو طالب علموں کو امتیازی نمبروں کے حصول پر وظائف بھی تقسیم کرتی ہیں اردو زبان پورے ہندوستان کی عام بول چال کی زبان ہے۔فلم انڈسٹری میں جو فلمیں معرض وجود میں آتی ہیں۔کہانی مکالمے اور نغمے سب کچھ

اردو میں تخلیق کئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی فلم مذکورہ لوازمات سے عاری رہتی ہے تو وہ باکس آفس پر ہی فلاپ ہو جاتی ہے۔ ان فلموں کی دھوم شمالی ہند کے علاوہ دیگر ریاستوں اور غیر ممالک میں بھی ہوتی ہے۔ پاکستان میں ہندوستانی فلموں کے شیدائی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ کیا یہ غلط ہے؟ عصمت کی اس حقیقت بیانی نے پاکستان کے ادباء وشعراء کو لاجواب کر دیا۔ اس حقیقت کا ادراک ہونے کے بعد بھی پاکستانی عوام وخواص کا بیشتر حلقہ ان کی مذمت کرتا رہا لیکن عصمت نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

یوں تو اردو کو پاکستان میں حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ جہاں اردو ادب کے پرستاروں کی خاصی تعداد موجود ہے مگر جب ہندوستان میں کوئی اردو کتاب شائع ہوتی ہے خواہ وہ نثری ہو یا شعری فوراً پاکستان میں برق رفتاری سے خبر ہو جاتی ہے یہ کوئی عیب کی بات نہیں بلکہ اسے شوقِ زبان اردو سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو اردو ادب کے لئے ایک خوش آئند بات ہے۔

عصمت نے اپنے اس رپورتاژ میں نہ صرف زبان وادب اور سیاسی امور کو موضوع بحث بنایا بلکہ پاکستانی معاشرت کو بھی اپنے نوک قلم کی زینت بخشی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہاں کی خواتین میں بالخصوص حصول تعلیم کا ذوق اور ملازمت کی چاہت بڑی شد و مد سے پائی جاتی ہے۔ روشن خیال لڑکیاں اور آزاد خیال ذہن وشعور کی حامل خواتین کی سوچ ترقی یافتہ ممالک کی خواتین کی مانند ہے۔ ان میں خود کفالت اور از خود نئے معاشرے کو جنم دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ انھیں فرسودہ اور بوسیدہ ماحول سے نفرت ہے اور گھٹے ہوئے خیالات وافکار سے نجات کی طالب ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عصمت نے جو پاکستانی معاشرہ دیکھا اور جو محسوس کیا اس کا ذکر رپورتاژ میں کر کے اپنی برسوں کی دبی خواہشات کو اجاگر کیا ہے۔ جب ایک فنکار سماجی مطالعہ کرتا ہے تو اس کی تہہ تک پہنچتا ہے جس سے ایک پختہ سماجی شعور وجود میں آتا ہے۔

عصمت نے ''ینگ رائٹرز'' کے اجلاس کے متعلق بتایا کہ یہ اجلاس اپنی نوعیت کا انوکھا اجلاس تھا۔ نوجوان ادیبوں اور نامہ نگاروں نے اپنے اپنے مقالے پڑھے اور خواتین وحضرات نے ان مقالہ نگاروں کی خوب پذیرائی کی اور موضوع بھی عصری خیالات کا حامل تھا۔ بالخصوص خواتین اور روشن خیال معاشرے پر زور دیا گیا تھا۔ بعد ازاں انھوں نے بھی

اپنی تقریر کے ذریعہ بالخصوص پاکستانی فنکاروں کو ہندوستان کے دانشوروں اورعوام کی جانب سے نیک تمناؤں اور برادرانہ خلوص کا سندیش دیا اور امید ظاہر کی کہ اگر ادیب وشاعر ہند و پاک کے دیرینہ مسائل کو از خود صلاح ومشورہ سے حل کرنے کے لئے پیش قدمی کریں تو جملہ تنازعے باہمی بات چیت سے ہی ختم ہو سکتے ہیں۔

اسی دن شام کو عصمت کے اعزاز میں پاکستان کی ''آرٹس کونسل'' نے ''اخبار خواتین'' کی جانب سے ایک پروگرام ان کے نام سے منسوب کیا جس میں جواں سال متعدد شعراء نے اپنا تازہ کلام پیش کیا، جس کی عصمت نے خوب تعریف کی۔

ریڈیو پاکستان کی ورلڈ سروس نے ایک مباحثہ کی صدابندی کی جس میں محمود شام، ابوالخیر کشفی، ہاجرہ مسرور وغیرہ شرکا کی حیثیت سے موجود تھے۔اس مباحثہ کے ذریعہ حیات انسانی کے گوناگوں پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا بالخصوص عصر حاضر کی خواتین کی معاشرے میں ان کے رول اوران کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک پر زوردار بحث کی گئی۔علاوہ ازیں نئے ادب میں درپیش مسائل نئے فنکاروں کی تخلیقات پر گفتگو مباحثہ کا خاص محور ومرکز رہا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین نے غالب لائبریری میں ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا۔اس میں جس امر پر زیادہ زور دیا گیا وہ ترقی پسند تحریک کی بابت تھا۔تحریک کے بارے میں لوگوں نے ان سے جو پوچھا جس کا مدلل جواب انھوں نے دیا اور جواب ایسا دیا کہ لائبریری کے ہال میں سکتہ طاری ہو گیا۔کسی نے دوسرا سوال کرنے کی ہمت نہیں کی۔

بعد ازاں عصمت کو ماہنامہ ''نقوش'' کے مدیر و مالک طفیل احمد صاحب کا لاہور سے فون آیا کہ آپ لاہور تشریف لائیں۔طفیل صاحب ہند و پاک کے قلم کاروں کے بڑے عزیز ناشر اور ہم خیال وہم مشرب تھے۔ادیبوں سے ان کی خوب بنتی تھی۔ بھی ادیب وشاعر سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ان کی دوستی میں اپنائیت جھلکتی تھی۔بہر حال عصمت بذریعہ ہوائی جہاز لاہور پہنچ گئیں۔ایر پورٹ پر منٹو کی بیوی صفیہ بیگم کو ہوائی جہاز کے بالکل قریب حاضر پایا۔دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر روئیں اور ماضی کی یادیں تازہ ہو گئیں۔اس کے علاوہ وہاں سردار جعفری کی دو بہنیں بھی موجود تھیں۔

لاہور میں عصمت عزیز الحسن کے ساتھ شاہ نور اسٹوڈیو دیکھنے گئیں۔وہاں فلم ہدایت

کاراور اسٹوڈیو کے خالق و مالک شوکت حسین سے ملاقات کی۔انھوں نے اپنے اسٹوڈیو کی سیر کرائی اور اپنی پاکستانی فلمی دنیا کی مصروفیات بتائی اور ساتھ ہی اپنی سُپر ہٹ فلموں جیسے زینت، جگنو اور دوست کی بابت مفصل گفتگو کی۔شوکت صاحب نے اس بات کو زور دے کر کہا کہ ہندوستان کے مقابلے پاکستان میں فلمی دنیا کافی کمزور ہے۔فلم بینی کا ذوق رکھنے والوں کی تعداد کم نہیں، لیکن پاکستانی فلموں کو وہ مقبولیت نہیں ملتی جو ہندوستانی فلموں کو حاصل ہے۔پاکستان میں سنیما ہال بھی محدود ہیں۔ان کی تعداد میں کوئی اضافہ مستقبل قریب میں نظر نہیں آتا چنانچہ پاکستانی فلم انڈسٹری کا مستقبل تاریک ہے۔

اسی روز طفیل صاحب نے عصمت کو عشائیہ دیا جس میں اردو ادب کے بلند پایہ نقاد عبادت بریلوی، وقار عظیم اور افسانہ نگار خدیجہ مستور کے علاوہ عبدالرحیم صاحب اور حجاب امتیاز علی صاحب جیسی نامور شخصیت نے شرکت کی۔عبدالرحیم صاحب نے اس موقع پر عصمت کو انتہائی قیمتی اور نادر تحائف پیش کئے۔

پھر دوسرے دن حفیظ اللہ حسن نے عصمت کو ڈنر پر مدعو کیا۔ جہاں عصمت کی ملاقات ملکۂ ترنم نور جہاں سے ہوئی اور فلم اداکار سنتوش کمار جو بنگالی فلموں کے دلیپ کمار کہے جاتے تھے اور پاکستان میں انھیں سُپر اسٹار کا مرتبہ حاصل تھا، عصمت کی دونوں سے خوب ساری باتیں ہوئیں۔

''فلم رائٹرز گلڈ'' کی جانب سے ایک اجلاس منعقد ہوا جس کی مسند صدارت فیض احمد فیضؔ نے سنبھالی۔اجلاس ہٰذا میں خود عصمت پر خدیجہ مستور اور ممتاز مفتی نے مقالے پڑھے۔مقالہ میں ممتاز مفتی نے عصمت کو جابجا ہدف تنقید بنایا، لیکن عصمت خاموش بت بنی بیٹھی رہیں۔بادل نخواستہ کبھی ان کے منہ سے واہ واہ نکلتے پھر خاموش ہو جاتیں۔

لاہور سے عصمت نے ریل کا سفر طے کر کے اسلام آباد پہنچیں۔ جہاں عصمت اپنے بچھڑے ہوئے خاندانی ممبروں اور دیگر متعلقین ولواحقین سے ملنے میں مصروف رہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنے چہیتے بھائی مرحوم عظیم بیگ چغتائی کے فرزند ارجمند میجر زعیم بیگ چغتائی سے بھی ملاقات کی۔اسلام آباد چونکہ پاکستان کا وفاقی شہر اور ملک کی راجدھانی ہے اس لئے یہاں کے نظم ونسق، شفافیت اور نفاست کو عصمت نے خوب سراہا۔ بعد ازاں

عصمت نے یہاں شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی سے شرف نیاز حاصل کیا۔ان سے ملنے کے بعد وہ احساسات وجذبات از سر نو جواں ہو گئے۔ان کی گھن گرج آواز یں عصمت کے ذہن و شعور میں پھر سے تازہ ہو گئیں اور ہندوستانی ادبی محافل واجلاس کے شبانہ روز واقعات پھر سے ذہن میں کوندنے لگے۔

عصمت نے ''یہاں سے وہاں تک''میں فن رپورتاژ نگاری کا حق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے متعلقین ولواحقین سے ملاقات کے لمحوں کو اپنے نوکِ قلم سے جلا بخشی ہے۔ اگر ہم اس رپورتاژ کو عصمت کے خاندانی افراد، متعلقین ولواحقین کے دلی جذبات اور والہانہ محبت کا مرقع کہیں تو مضائقہ نہ ہوگا۔رپورتاژ کا بیشتر حصہ ان کے خاندانی افراد اور ان کے کرب واضطراب کا نمائندہ ہے۔ادیبوں اور شاعروں کی متعدد مواقع پر عصمت سے ملاقاتیں، رپورتاژ کی دھڑکن محسوس کی جا سکتی ہیں۔ادبی وغیر ادبی جلسوں اور سیمیناروں کے ذریعہ عصمت نے اپنے ذاتی خیالات ومشاہدات کا ذکر کر کے دراصل اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے جو برسوں سے ان کے قلب وذہن میں مقید تھیں۔اس رپورتاژ کے ذریعہ ایک تیر سے دو وار کئے برسوں سے دبی ہوئی خواہشات کا اظہار بھی کیا اور اظہار بیان کو ادب کی دنیا میں رپورتاژ کا نام دے کر ادبی ذمہ داری کا حق بھی ادا کیا۔یہ ایک اچھے رپورتاژ نویس کی پہچان ہے۔عصمت نے رپورتاژ ''یہاں سے وہاں تک'' کو نہ صرف اپنی خوبصورت انداز نگارش دیا بلکہ اپنی منفرد اسٹائل سے اسے خوب سے خوب تر بنا دیا ہے۔اس رپورتاژ کے مطالعہ سے اس کا بین ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ وہ صرف افسانہ نگار یا ناول نگار ہی نہیں بلکہ ایک کامیاب رپورتاژ نگار کا درجہ بھی رکھتی ہیں۔

بحیثیت مجموعی عصمت نے جس انداز سے رپورتاژ جیسی نئی صنف میں اپنا قلم اٹھایا ہے اسے دیکھ کر بخوبی اندازہ لگ جاتا ہے کہ واقعات کے بیان پر ان کی پوری گرفت رہتی ہے۔ناول اور افسانے میں ان کا جو مخصوص اسلوب رہا ہے وہی اسلوب اپنی پوری تابانی کے ساتھ اس نوزائیدہ صنف میں بھی موجود ہے۔اسے رپورتاژ کیوں کہئے یہ تو واقعات کا ایک تسلسل تھا جو ہمارے سامنے آتا جا رہا تھا۔

☆☆

باب چہارم

عصمت چغتائی کی خودنوشت سوانح نگاری

خودنوشت سوانح حیات ایک انسان کی پیدائش سے لے کر پوری زندگی کی داستان ہوتی ہے۔جس میں خصوصی واقعات سے لے کر عمومی واقعات تک قلم بند کئے جاتے ہیں۔اردو میں خودنوشت سوانح حیات کی اہمیت کا باقاعدہ احساس دیر میں ہوا۔لیکن جہاں تک اردو نثر میں اس کی ابتدا کا سوال ہے تو اس کا آغاز اردو نثر کی ابتدا ہی سے ملتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اس کے نقوش بہت زیادہ نمایاں نہیں تھے۔مثلاً صوفیائے کرام کے خطوط،جعفر تھانیسری کی تحریریں،ظہیر دہلوی کی داستانِ حیات،باغ و بہار کا مقدمہ اور مرزا غالب کے خطوط وغیرہ میں سوانحی عناصر پائے جاتے ہیں۔خودنوشت سوانح حیات کو آپ بیتی بھی کہا جاتا ہے۔آپ بیتی لکھنے کے لئے کوئی قید نہیں ہوتی کہ وہ طویل ہو یا مختصر اس کو لکھنے کے لئے کسی خاص طریقۂ کار کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔یہ محض اپنے بارے میں اپنے حالات کا اظہار ہوتا ہے۔بالفاظ دیگر مصنف کے خود کے لکھے ہوئے حالات خودنوشت کہلاتے ہیں۔یہ اس کی کوئی شرط نہیں ہے،بلکہ یہی عام طور پر رائج ہے اور نظم کی بہ نسبت آسان بھی۔کچھ منظوم آپ بیتیاں بھی ملتی ہیں جیسے واجد علی شاہ اور منیرؔ شکوہ آبادی نے اپنی آپ بیتیاں نظم کے قالب میں ڈھالی ہیں۔انسائکلو پیڈیا بریٹنکا کے مطابق:

> ''آپ بیتی کسی ایسے شخص کی ایسی سوانح حیات ہے جو خود اس نے لکھی ہو اس کے محرکات مختلف ہوتے ہیں۔منجملہ دیگر باتوں کے اخلاقی اصلاح کے لئے اپنے آپ کو پرکھنا،اپنے افعال کی تاویل کرنا،حسین یادوں اور پرانی باتوں کو تر و تازہ کرنے کی کوشش۔یہ عقیدہ کہ ممکن ہے کہ اپنے تجربات دوسروں کے لئے معاون ہوں الجھی ہوئی دنیا میں اپنی ذات کی واضح سمت متعین کرنے کی پُرشوق کوشش،فن کارانہ اظہار کی تمنا یا شہرت اور رتبے سے فائدہ اٹھانے کی خالصتہً کاروباری کوشش۔''(۱)

جانسن کی رائے یہ تھی کہ:

''کسی شخص کی زندگی کا حال خود اس سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا۔'' (۲)

خودنوشت ایک ایسا فن ہے۔جس کا موضوع خود فن کار کی ذات ہے،اس کا مرکز اصلاً داخلی بلکہ شدید داخلی ہے۔اس میں فن کار کی خارجی زندگی کی جھلکیاں بھی داخلی لفافے میں لپٹی ہوئی ہوتی ہیں محور داخلی ہوتا ہے اور خارجی عنصر اس سے گریز نہیں کرسکتا ہے۔ خودنوشت حقیقت پرمبنی ہوتی ہے۔آپ بیتی لکھنے والے کے لئے اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ شاعر اور افسانہ نگار کی طرح تخیل اور تصور کی دنیا آباد کرے اس میں شخصیت کے ایسے خط و خال واضح ہوتے ہیں جن سے مصنف کے علاوہ اور کوئی واقف نہیں ہوتا۔آپ بیتی میں تنوع اور رنگا رنگی ہوتی ہے۔رنگا رنگی اس قدر ہوتی ہے۔جس قدر انسان کی زندگی۔خودنوشت کے تین محور ہوتے ہیں۔سچائی، شخصیت اور فن۔سچائی اور حقیقت نگاری آپ بیتی کے لئے سب سے بنیادی چیز ہوتی ہے اور شخصیت تو وہ محور ہے۔جس کے بغیر خودنوشت کا وجود ہی ممکن نہیں۔فن بھی ضروری ہے اس لئے کہ خودنوشت محض یادداشت ہی بن کر نہ رہ جائے بلکہ ایک ادبی کارنامہ بھی ہو۔

اردو ادب میں شعروشاعری،افسانہ اور ناول نگاری وغیرہ گویا تخلیقات کا ایک سیل رواں ہے۔تنقید پر بھی اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے،لیکن سوانح حیات کم ہیں اور خودنوشت سوانح حیات اس سے بھی کم ہیں۔ڈاکٹر صبیحہ انور لکھتی ہیں:

> ''منجملہ دیگر باتوں کے ایک کمی اردو خودنوشت سوانح حیات کے سلسلے میں یہ بھی ہے کہ خاتون قلم کاروں کی قابل لحاظ تعداد ہونے کے باوجود اس وادی میں قدم رکھنے میں تامل رہا ہے۔نواب سلطان جہاں،بیگم فرمانروائے بھوپال کی خودنوشت سوانح حیات ''تزک سلطانی'' یعنی تاج الاقبال ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی۔اگرچہ یہ تالیف اس زمانے کی ہے جب خودنوشت کی روایت زیادہ عام نہ تھی،لیکن اس میں بھی ہمیں ایک عورت کا دل دھڑکتا ہوا نظر نہیں آتا ہے۔ ریاست کی سیاسی ریشہ دوانیوں اور انتظامی امور کی دشواریوں کا تفصیلی بیان ہی ملتا ہے۔'' (۳)

عصمت چغتائی نے مضامین کی شکل میں اپنے متعدد سوانحی حالات لکھے ہیں۔
عصمت چغتائی کی پہلی خودنوشت ۱۹۴۷ء میں ''محمل'' مرتبہ محمد الدین موجد بدایونی میں شائع ہوئی۔ یہ خودنوشت عصمت شاہد لطیف'' کے نام سے ہے۔ اس میں انھوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ حقیقت پرمبنی ہے۔ انھوں نے بے تکلف لکھا ہے کہ میرا بچپن ناسازگار حالات میں گزرا ہے۔ اور میری تعلیم نہایت بے ڈھنگے پن سے ہوئی ہے۔ انھوں نے اس آپ بیتی میں اپنے لکھنے پڑھنے کے طور طریقے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھا ہے کہ:

''......... مطالعہ کا شوق نہایت بے ڈھنگا ہے۔ نہیں پڑھتی تو روزانہ اخبار تک نہیں پڑھتی اور جو پڑھنا شروع کرتی ہوں تو دن رات ایک ہو جاتے ہیں، یہی حال لکھنے کا ہے۔ سال میں ایک آدبار لکھنے کا دورہ سا پڑتا ہے اور وہ بھی سستی کے زمانے میں جب کچھ کام نہیں ہوتا اور جی گھبرانے لگتا ہے تو لکھتی ہوں اور اس قدر تندہی سے لکھتی ہوں کہ سوچنے کے لئے بھی نہیں رکتی تنہائی میں لکھنے کی عادت نہیں چونکہ کبھی نصیب ہی نہ ہوئی غدر مچتا ہوتا ہے، ریڈیو بجتا ہوتا ہے اور بچے کشتیاں لڑتے جاتے ہیں اور میں لکھتی ہوتی ہوں، یہی وجہ ہے کہ میرے مضامین میں ایک دوڑی آجاتی ہے لشتم پشتم بھاگم بھاگ مچی رہتی ہے۔ شروع زمانہ سے لے کر آج تک ایک مسلسل چلو چلو!'' (۴)

انھوں نے اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ میرا پہلا مضمون کب اور کیسے چھپا اور کس قدر پسند کیا گیا۔
عصمت چغتائی کی دوسری آپ بیتی ''نقوش کے''،'' آپ بیتی نمبر'' میں جون ۱۹۶۴ء میں بعنوان ''عصمت چغتائی'' اشاعت پذیر ہوئی۔ اس میں انھوں نے اپنی پیدائش اور پرورش پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی اس آپ بیتی کے مطالعہ سے ان کی فطرت، ان کے مزاج اور ان کے رجحانات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔
بقول ظفر ادیب ''عصمت اپنی فطرت، اپنے مزاج اور اپنے رجحانات کی نشاندہی کرتی ہیں، نقوش کے'' آپ بیتی نمبر میں'' ان نشان دہیوں سے ان کے غور وفکر کی سمتیں،

ان کی فطرت کی حدود ان کے مزاج کی کیفیتیں متعین ہوتی ہیں، جو ہماری بڑی حد تک رہنمائی کرتی ہیں۔''(۵)

مثلاً ایک جگہ عصمت لکھتی ہیں: ''......وہ بیج جس سے میری ہستی وجود میں آئی۔ قطعی ٹیڑھا میڑھا نہ تھا۔ ضرور پالنے پوسنے میں کہیں بھول چوک ہوگئی۔

مگر مجھے بذاتِ خود اس ماحول سے کوئی شکایت نہیں جہاں میری تراش خراش ہوئی۔ کچر بچر بچوں کے جم غفیر میں ایک پا پیادہ سپاہی کی طرح تربیت پائی۔ نہ لاڈ ہوئے نہ نخرے، نہ کبھی تعویذ گنڈے بندھے نہ نظر اتاری گئی نہ خود کو کبھی کسی کی زندگی کا اہم حصہ محسوس کیا۔''(۶)

اس خودنوشت سے یہ بھی اندازہ لگتا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عدم توجہی کی وجہ سے وہ اپنے بھائیوں اور محلے کے لڑکوں کے درمیان بے محابا اٹھتی بیٹھتی، کھیلتی اور کودتی تھیں۔ ان کے درمیان جھگڑے، تکرار اور مار پیٹ بھی ہوتی تھی، انھیں شرم و حیا چھو تک نہیں گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ گھر خاندان یا محلے کی بڑی بوڑھیاں انھیں پسند نہ کرتی تھیں، اس خودنوشت میں انھوں نے اپنی افسانہ سے دلچسپی اور افسانہ لکھنے کی ابتدا کے متعلق بھی روشنی ڈالی ہے، اور رشید جہاں سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے وہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''..........اور شاید کیا بلکہ قطعی میں نے ان کے افسانے پڑھ پڑھ کر خود بھی چھپا کر لکھنا شروع کر دیا۔ حجاب اسمٰعیل، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ سب کچھ میرے ہی اوپر بیت رہی ہے، اور پھر میں نے خود کو افسانہ کی، ہیروئن تصور کر کے نہایت چٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کیا۔'' (۷)

عصمت چغتائی کی تیسری آپ بیتی ''بیتے ہوئے دن کچھ ایسے ہیں''(خط کی صورت میں)۱۹/اپریل ۱۹۶۶ء میں ''ویمنز کالج میگزین'' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں چھپی ہے۔ ان کی اس آپ بیتی کے مطالعہ سے ان کے طالب علمی کے زمانے کی متعدد جھلکیاں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں ساتھ ہی ویمنز کالج کی بنیاد کب کیوں کر پڑی اس کے لئے پاپا میاں اور اعلیٰ بی نے کس قدر دوڑ دھوپ کی اور کس طرح وہ ایک مکتب سے ایک کالج بنا

علاوہ ازیں اپنی ہم جماعت لڑکیوں کے ساتھ پڑھنے، رہنے سہنے اور جلسے جلوس وغیرہ کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ انھیں ویمنز کالج سے اس قدر محبت تھی کہ کالج چھوڑنے کے بعد بھی اس کی یاد انھیں ہمیشہ ستاتی رہی اس کا اندازہ اس آپ بیتی کے آخری اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے لکھتی ہیں:

"........مجھے اسکول بہت یاد آرہا ہے آپ یاد آرہی ہیں۔ اختر جمیلہ اور قیصر یاد آرہی ہیں۔ میرا کمرہ اور دیوالی کی کھیر یاد آرہی ہے۔ وہ نویں جماعت کا کمرہ یاد آرہا ہے جہاں مس رام نے حساب پڑھاتے وقت بار ہا سر پیٹ لیا تھا اور وہ نیلا پردہ جس کے پیچھے بیٹھ کر ماسٹر عثمان شعروں کے حُسن پر داد دیا کرتے تھے اور وہ باسکٹ بال کا میچ یاد آرہا ہے جس میں ہم بے ایمانی سے گزشتہ سال جیتے تھے۔" (۸)

عصمت چغتائی کی چوتھی خودنوشت "غبار کارواں" کے عنوان سے ماہنامہ "آجکل" نومبر ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔ اس خودنوشت میں انھوں نے اپنی زندگی کے دیگر واقعات کے ساتھ بچپن کے واقعات پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنی پرورش کے متعلق بیان کرتی ہیں:

"ہم اتنے سارے بچے تھے کہ ہماری اماں کو ہماری صورت سے قئے آتی تھی۔ ایک کے بعد ایک ہم ان کی کوکھ روندتے کچلتے چلے آئے تھے۔ اُلٹیاں اور درد سہہ سہہ کر وہ ہمیں ایک سزا سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھیں کم عمری ہی میں پھیل کر چبوترہ ہوگئی تھیں۔ پچیس ۳۵ برس کی عمر میں وہ نانی بھی بن گئیں اور سزا اور سزا جھیلنے لگیں۔ ہم بچے نوکروں کے رحم وکرم پر پلتے تھے اور ان سے بے طرح مانوس تھے۔" (۹)

ایک واقعہ انھوں نے یوں بیان کیا ہے کہ وہ کسی مجلس میں گئیں مرثیہ پڑھا جارہا تھا۔ جب علی اصغر کے حلق میں تیر مارنے کا ذکر آیا تو وہ خوف ودہشت سے چیخنے لگیں۔ اس پر لوگوں نے انھیں وہاں سے نکال دیا۔ وہ گھر آکر سوگئیں تو خواب میں بھی انھوں نے وہی

کچھ دیکھا جو وہاں سنا تھا اور چونک کر اٹھ بیٹھیں اور چیخنے لگیں۔ ان کی اماں نے بجائے ہمدردی کے اوپر سے ان کی پٹائی بھی کی۔ لیکن ان کے یہ جاننے کی خواہش اور جاگ پڑی کہ اصغر کی حلق میں تیر کیوں مارا گیا تھا۔ انھوں نے اپنی نوکرانی سے دریافت کیا اور اس نے جس انداز میں انھیں سمجھایا تھا، اس سے یہ بہت متاثر ہوئیں۔

عصمت چغتائی کی پانچویں خودنوشت ''میرے زمانے کا علی گڑھ'' کے نام سے آجکل دہلی اپریل ۱۹۷۱ء کے شمارے میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس میں انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے ماحول اور فضا کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کا ایک الگ ماحول ایک انفرادی مقام و مرتبہ ہے اور اس کے مخصوص ماحول اور فضا میں اب بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے، جیسا کل تھا ویسا ہی آج بھی ہے۔ بہت ہوا ہے تو چند پرانی کوٹھیاں ڈھا کر کچھ نئی عمارتیں تعمیر کر دی گئی ہیں۔ بقول عصمت:

> ''.......... میں جب بھی وہاں جاتی ہوں۔ لوگوں سے ملتی ہوں، کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ وہی مروت اور محبت خاطر داری، دعوتیں اور بلاوے۔ گرلز کالج کا کوئی فنکشن بالکل ویسا ہی جیسا تیس برس پہلے ہوا کرتا تھا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے۔ لڑکیاں بھی وہی ہیں ہاں عمارتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ حالانکہ پندرہ بیس منزلہ عمارت نہیں بنی اونچے ہوٹل اور سینما گھر نہیں بنے وہی پرانے شہر کے میلے سینما ہیں۔
>
> پہلے ایک زمانہ کلب بھی تھا۔ جہاں خواتین ٹھاٹ کے کپڑے پہن کر جمع ہوتی تھیں۔ پھر آئے دن کے نئے کپڑوں کے خرچ سے تنگ آ کر کلب بند کر دیا گیا اور اب شاید کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں سب آزادی سے مل بیٹھ سکیں''(۱۰)

عصمت چغتائی کی ایک خودنوشت ''کاغذی ہے پیرہن'' کے نام سے ماہنامہ آجکل دہلی میں چھپی ہے۔ یہ خودنوشت قدرے طویل ہے اس لئے قسط وار چھپی ہے اور ہر قسط کا اپنا ایک الگ عنوان ہے بقول ڈاکٹر صبیحہ انور ''عصمت چغتائی نے اپنے بچپن کی

یادیں اور خاندانی حالات'' کاغذی ہے پیرہن'' کے عنوان سے لکھنا شروع کئے ہیں۔ یہ یادیں قسط وار مضامین کی شکل میں ماہنامہ'' آجکل'' دہلی میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔'' (۱۱)

پہلی قسط'' ادھوری عورت'' کے عنوان سے چھپی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے حالات کم اور خاندان کے زیادہ بیان کئے ہیں۔

اس خودنوشت میں انھوں نے اپنے جاورے کے سفر کا بھی ذکر کیا ہے جو بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس وقت عورتوں میں تعلیم کا رواج نہیں کے برابر تھا اس لئے عصمت کا بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ہونا کسی معجزے سے کم نہ تھا جب وہ جاورے پہنچیں تو وہاں کے نواب صاحب ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ لکھتی ہیں۔

> '' جاورہ میں میری آمد کی دھوم مچ گئی۔ بی۔ اے۔ اور وہ بھی مسلمان لڑکی، قطعی معجزہ تھا۔ وہاں تو دو چار ہی گریجویٹ تھے اور ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ صرف ہیڈ ماسٹر بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ تھے۔ نواب صاحب میری آمد سے بہت خوش تھے اور بڑی تیزی سے مجھے جاورہ میں کھپانے کے جتن ہونے لگے۔'' (۱۲)

اس خودنوشت کی دوسری قسط'' پھر علی گڑھ چھوٹا'' کے عنوان سے آج کل دہلی اگست ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں انھوں نے علی گڑھ کے رہائشی مکان کے ساتھ ساتھ اپنے گھر خاندان بھائی بہنوں، بھابیوں اور ماں۔ غرضیکہ گھر کے تمام افراد کا ذکر خوب مزے لے لے کر کئے ہیں۔ علی گڑھ میں وہ جس مکان میں قیام پذیر رہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> '' کمبخت محل ایک بوسیدہ تین منزلہ کھنڈر تھا۔ ابا میاں پہلے سے پہنچ گئے تھے۔ نیچے کی منزل میں نوکر اور باورچی خانہ تھا اس کے اوپر زنان خانہ تھا جس میں ٹھوس دئے گئے۔ ایک لمبا سا برآمدہ اور دو کمرے چھوٹا سا گھٹا ہوا صحن اور ایک دالان در دالان۔ اس کے اوپر ابا میاں کے تین کمرے ایک برآمدہ مختصر سی چھت اور ایک کوٹھری تھی۔ ابا کے کمرے میں ایک لمبی چوڑی چھت پر کھلتے تھے۔ لیکن اس کے

دوسرے سرے پر کچہری کے کمرے تھے دن بھر اس چھت کے دروازے
بند رہتے۔ اور چھت پر سپاہیوں اور مجرموں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ دن بھر
ہتھکڑیاں بیڑیاں بجاتے قیدی اترا چڑھا کرتے۔'' (۱۳)

اس خودنوشت کی تیسری قسط ''لوہے کے چنے'' کے عنوان سے آجکل دہلی ستمبر ۱۹۷۹ء میں منظر عام پر آئی۔ اس خودنوشت میں عصمت نے اپنے والدین کے شب و روز کے پروگرام پر روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی میٹرک کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے علی گڑھ جانا اور وہاں کے طالب علمی کے زمانہ کی یاد اور ہاسٹل کا قیام وغیرہ کا بیان بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

اس خودنوشت میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب علی گڑھ پہنچیں اور عبداللہ گرلز کالج میں داخلہ لیا تو وہاں ان کا داخلہ نویں درجہ میں ہوا لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں ہوئیں، انھوں نے ٹیچروں اور پرنسپل سے ضد کی کہ میرا داخلہ دسویں درجے میں ہونا چاہئے۔ پرنسپل نے سمجھایا کہ فیل ہو جاؤ گی۔ کالج کا نتیجہ خراب ہوگا۔ لیکن وہ نہیں مانیں، برابر اصرار کرتی رہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں محنت کروں گی، مجھے موقع دیجئے، میں آپ کو ناامید نہیں کروں گی۔ اس سلسلہ میں عصمت رقمطراز ہیں:

''مجھے نویں میں داخلہ مل چکا تھا مگر میں نے ضد کی کہ دسویں میں
داخلہ لوں گی۔ خاتون آپا نئی نئی پرنسپل بنی تھیں۔ سمجھانے لگیں کہ
اسکول کا نتیجہ خراب ہوگا۔ تم فیل ہو جاؤ گی — میں فیل نہیں ہوں گی
اور فرض کیجئے ہوگئی تو کیا فرق پڑے گا وہی بات ہو جائے گی۔ میں
نے سرسری انداز میں بتایا کہ میں کن مشکل راہوں سے گزر کر بورڈنگ
میں آئی ہوں، سارے خاندان کو ناراض کیا ہے۔ مجھے کامیاب ہونا
ہے۔ میں ٹیوشن لوں گی۔ دن رات پڑھوں گی آپ نے میرے اردو
کی پختگی نہیں آزمائی۔ مجھے موقع دیجئے شاید میں آپ کو ناامید نہ
کروں۔ میں تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئی ہوں۔ نیرا کو تو اس کی ماں
فخریہ پڑھا رہی ہیں، میں سارے خاندان سے لڑ کر آرہی ہوں۔

اس وقت رحمت کے فرشتہ کی طرح اعلیٰ بی آ گئیں۔ اعلیٰ بی یعنی بیگم شیخ عبداللہ بانی علی گڑھ گرلز کالج روزانہ بورڈنگ اور اسکول میں چکر لگایا کرتی تھیں۔ انھوں نے بڑے زور سے میری حمایت کی اور اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔

''ارے بی خاتون چولہے میں ڈالو اسکول کے نتیجے کو بچی محنت کرنے کو کہتی ہے۔ اسے موقع دو۔'' (۱۴)

بالآخر دسویں جماعت میں داخلہ ہوا اور انھوں نے زبردست محنت کی اور کامیاب بھی ہوئیں۔

''کاغذی ہے پیرہن'' کی چوتھی قسط ''علی گڑھ'' کے عنوان سے ماہنامہ آجکل دہلی اکتوبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں انھوں نے علی گڑھ گرلز کالج کے بورڈنگ کی زندگی کو خاص طور سے بیان کیا ہے۔

''انگارے'' کی اشاعت انھیں دنوں ہوئی تھی، اور چاروں طرف واویلا مچ گیا تھا۔ بہت سارے لوگوں نے اس کی پرزور مخالفت کی تھی۔ اس پر فحاشی کا الزام لگایا گیا تھا۔ ان میں مُلّا شاہد احراروی پیش پیش تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار میں ''انگارے'' کے ساتھ ہی ساتھ کالج کی بھی مذمت کی تھی یہاں تک کہ اسے رنڈی خانہ قرار دیا تھا۔ کالج کی کسی لڑکی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنی زبان کھولتی۔ عصمت نے بھی ''انگارے'' کے افسانوں کو پڑھا۔ انھیں اس میں کہیں بھی کوئی فحش چیز نظر نہیں آئی۔ انھوں نے مُلّا احراروی کے خلاف بڑے سخت الفاظ میں ایک مضمون لکھا اور اسے علی گڑھ گزٹ میں شائع کروایا۔ اس کے چھپتے ہی یونیورسٹی کے لڑکے برافروختہ ہو اٹھے اور مُلّا احراروی کی خوب پٹائی کی اور دفتر بھی توڑ پھوڑ ڈالا۔ اس روز سے مُلّا احراروی غائب ہو گئے۔ عصمت یوں لکھتی ہیں:

''انگارے'' پڑھ کر ملا احراروی کا چیتھڑا پڑھا تو جی خوب جلا اور میں نے ایک مضمون لکھا۔ کچھ اس قسم کا کہ 'مسلمان لڑکیاں پہلے ہی محروم اور پچھڑی ہوئی ہیں اوپر سے کٹر مُلّا احراروی جان کا دشمن ہو رہا ہے۔ کالج بند کرا دیا جائے مگر ہم ساری لڑکیاں کی یہاں سے لاشیں ہی

جائیں گی کون بند کرنے آئے گا ہم اس سے نمٹ لیں گے اور یونیورسٹی میں ہمارے چھ ہزار بھائی ہیں، کیا وہ خاموشی سے ہماری لاشوں کو کچلنا دیکھیں گے۔ جب بھی ہمیں مُلا احراروی کا خیال آتا ہے ہم اپنے چھ ہزار بھائیوں، بزرگ پروفیسروں، ٹیچروں کو یاد کر لیتے ہیں۔ تب ہماری ہمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ جب تک وہ سلامت ہیں، کوئی مائی کالال ہمارا بال بیکا نہیں کرسکتا۔ جھانسی کی رانی نے شہنشاہ ہمایوں کو راکھی بھیجی تھی۔ ہم کالج کی تمام لڑکیاں اپنے ہزاروں بھائیوں کی خدمت میں نیک خواہشات کے ساتھ احترام اور خلوص کی راکھی بھیجتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری رکھوالی کے لئے کوئی قدم اٹھائیں گے۔ میں نے مضمون جو طویل اور جذباتی تھا لڑکیوں کو سنایا ایک ہلڑ مچ گیا۔

پاپا میاں کو خبر پہنچی وہ آئے اور سنا اسی وقت لفافہ منگوا کر علی گڑھ گزٹ کو بھیج دیا۔ دوسرے دن مضمون چھپ گیا۔ لڑکوں نے وہ مضمون پڑھا اور اسی وقت جا کر مُلا احراروی کی خوب ٹھکائی کی۔ دفتر توڑ پھوڑ ڈالا۔ کسی کو اس کی حمایت کی ہمت نہ پڑی۔ ان لڑکوں کی رشتہ دار لڑکیاں کالج میں پڑھتی تھیں ان کے ذریعہ لڑکیوں کا شکریہ پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد مُلا غائب ہو گیا۔'' (۱۵)

''کاغذی ہے پیرہن'' کی پانچویں قسط ماہنامہ آجکل دہلی نومبر ۱۹۷۹ء میں ''سوجت'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ اس خودنوشت میں عصمت چغتائی نے علی گڑھ کالج سے (گرمی کی چھٹیاں گزارنے) راجستھان جانے تک کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے راجستھان کے علاقہ ''سوجت'' اور اس کے کلچر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس علاقہ میں ہندو مسلم اور دیگر طبقے کے لوگوں میں باہمی میل ملاپ اور ایک دوسرے کے خلوص و محبت کو بڑے دلکش اور مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اس زمانے میں راجستھانی کلچر اس طرح کا تھا کہ کوئی بھی تہوار ہو، کسی فرقے کا ہو اس میں برابر کے شریک ہوتے تھے یہاں تک کہ عصمت کے خاندان میں بھی راجستھانی تہذیب اور سوسائٹی کا اثر ہو گیا اور گھر کے بھی افراد

بہترین راجستھانی زبان بھی بولتے تھے۔ گھر کے بھی لوگ راجپوتوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے ساتھ ان کی سوسائٹی کو بھی اختیار کرلیا۔ یہاں تک کہ اپنے بچوں کا نام بھی تبدیل کر دیے۔ ہر وقت گھر میں راجپوتوں کی شان وشوکت کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''راجپوتوں کے ساتھ ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا اس لئے ہر وقت راجپوتی آن بان کا ذکر رہتا تھا۔ منّے بھائی نے فجّو کا نام موہن سنگھ چھبا کا سوہن سنگھ اور نو وارد کا نام فوراً مکھن سنگھ رکھ دیا۔ وہ تھا بھی مکھن ملائی جیسا نرم سفید۔ وہ کبھی ان کے اصلی نام نہیں لیتے تھے اور موہن مکھن سوہن ہی پکارتے تھے۔ بہت پیار آتا تو موہنیا سوہنیا اور مکھنی یا مکھو کہتے تھے۔ آج بھی صرف مکھو کا نام رہ گیا ہے۔ دونوں بڑے اب زعیم اور نجیم کہلاتے ہیں۔'' (۱۶)

''کاغذی ہے پیرہن'' کی چھٹی قسط ماہنامہ آجکل دہلی دسمبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کا عنوان ہے ''سونے کا اگلدان''۔ عظیم بیگ چغتائی ان کے بڑے بھائی جو ریاست جاورے کے جج تھے۔ ریاست کے نواب صاحب سے ان کے خاصے مراسم تھے۔ انھوں نے عصمت کو چٹھی لکھ کر جاورے بلایا تھا کہ یہاں آجاؤ بہتر رہوگی۔ چنانچہ عصمت جاورے پہنچ گئی تھیں نواب صاحب ان سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے ان کے لئے وہاں پر ایک اسکول کھول دیا تھا۔ جس میں ریاست کی لڑکیاں پڑھتی تھیں اور ان کی تنخواہ سو۱ روپے مقرر کردی تھی۔ جاورے کے اسکول میں جو لڑکیاں پڑھتی تھیں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''پچیس تیس لڑکیاں مختلف قد اور عمر کی جمع کردی گئیں۔ زیادہ تر شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور کچھ نہیں بس انگریزی پڑھنا اور بولنا سیکھنے کا شوق تھا۔
>
> سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے کیا مسخری کلاس تھی۔ بجی بنی لڑکیاں بڑی مہذب اور پیاری بڑے ادب سے بیٹھتیں۔ میں انھیں کچھ زبانی کچھ بلیک بورڈ کی مدد سے انگریزی لکھنا اور بولنا سکھاتی، بڑی دلچسپ کلاس ہوا کرتی تھی۔ کسی لڑکی کو نام سے نہیں پکارا جاتا تھا۔ بس ننھی بی،

میں ہوئی۔ لکھتی ہیں :

''میری ضیا سے ملاقات عجیب افسانوی انداز میں ہوئی..........اس بات کو سال سے زیادہ گزر گیا میں جاورہ سے بریلی آگئی تھی کہ ایک دن مجھے ایک نہایت خوبصورت لفافہ میں بے حد عمدہ ٹائپ کیا ہوا بڑا مہذب سا خط ملا...... کچھ دن بعد انھوں نے لکھا کہ انھیں بریلی میں کچھ کام ہے دو دن ٹھہریں گے مگر میں انھیں اسٹیشن پر مل جاؤں تو ساتھ لنچ کھائیں گے مگر ہم ایک دوسرے کو پہچانیں گے کیسے؟

ضیا نے بڑی سادگی سے لکھا کہ وہ گیارہ بجے کی گاڑی سے پہنچیں گے اور فرسٹ کلاس کے ڈبہ سے سرمئی سوٹ میں اتریں گے۔ ان کے ہاتھ میں اخبار ہوگا اور میرے ہاتھ میں گلاب کا پھول ہوگا اور میں فیروزی ساڑی پہنے رہوں گی تو ہم ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔'' (۱۹)

نویں قسط ''تعلیم نسواں۔ ایک وبال'' کے عنوان سے ''آجکل'' دہلی مارچ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں انھوں نے بریلی گرلز کالج میں اپنے تقرر اور چارج لینے کے بعد کے جن مراحل سے گزرنا پڑا انھیں تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ کلاس میں لڑکیوں کو پڑھانے سے لے کر کالج کے انتظامی امور میں بھی اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ بعض معاملات میں مینیجر صاحب ان کی رائے سے متفق نہیں ہوتے تھے۔ مثلاً لڑکوں کے کھیل لڑکیوں کو سکھانا وغیرہ مگر عصمت نے بچپن سے ضدی طبیعت پائی تھی وہ ہمیشہ اپنی مرضی ہی کے مطابق کرتی تھیں، لیکن جو کچھ کرتی تھیں وہ کالج کے مفاد ہی میں کرتی تھیں۔۔۔۔ وہ کہتی ہیں:

''بورڈنگ میں بڑا سا صحن تھا۔ کھیل کود کے لئے خوب جگہ تھی، مگر زاہدہ، عابدہ بلا کی شرمیلی اور نزہت مرگھلی اونچ نیچ آنکھ مچولی کسی کھیل میں بھی جان نہ پڑ جاتی۔ صرف مدحت اودھم مچا کر سب کو چت کر دیتی۔ میں نے گیند اور گلی ڈنڈا بھی سکھایا جس پر مینیجر صاحب بڑے پریشان ہوئے۔ سارے شہر میں خبر پھیل رہی ہے آپ لڑکیوں کو لڑکوں کے کھیل سکھا رہی ہیں۔۔۔۔

سب کھیل بچوں کے ہوتے ہیں، ان کی کوئی جنس نہیں ہوتی۔ میں نے بحث شروع کردی۔ آخر کون سے کھیل سکھاؤں۔ بیڈمنٹن کے لئے آپ سے کہا آپ ٹال گئے پھر بتائیے بچوں کو کب تک آنکھ مچولی کھلاتی رہوں .... میں نے بچوں کو پیڑ پر چڑھانا بھی سکھانا شروع کیا۔ جس پر بڑی لے دے ہوئی مگر لڑکیاں میری شہہ پا کر کسی کی نہیں سنتی تھیں .... مینیجر صاحب بے حد دکھی ہو جاتے۔

خدا کے لئے یہ آپ کیا کررہی ہیں؟ میرے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔" (۲۰)

"کاغذی ہے پیرہن" کی دسویں قسط "جہنم کے عنوان سے ماہنامہ آجکل دہلی میں اپریل ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس خودنوشت کی شروعات انھوں نے اپنی باجی کی شادی سے کی ہے۔ تمام روداد کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پھر اپنی راحت خالہ کا ذکر بھی کیا ہے جو کم عمری میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ اپنے والد صاحب کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ بہت مخلص اور ملنسار انسان تھے۔ ان کی دوستی مسلمانوں کے علاوہ بہت سارے ہندوؤں سے بھی تھی۔ اکثر گھر پر ہندو دوست کی دعوت تواضع بھی ہوا کرتی تھی۔ عصمت چغتائی بیان کرتی ہیں:

"ہندوؤں سے ان کے بہت جلدی مراسم پیدا ہو جاتے کہ وہ سمجھتے تھے یہ تو ناستک ہے۔ ابا میاں کی دوستی کی جڑیں بڑی مضبوط اور گہری ہوتی تھیں اور خاندانی دوستی قائم ہو جاتی۔ بیویاں لڑکے لڑکیاں گھل مل جاتے۔ اماں جب اپنی ہندو سہیلیوں کی دعوت کرتیں تو مہاراج کو بلا کر بالکل کورے برتن منگواتیں، کسی بچے تک کو اس طرف پھٹکنے کی اجازت نہ تھی بیویاں خود پوریاں بیلتیں پتیلیں دھو کر لگاتیں عموماً برآمدہ دھو کر کھانا پروسا جاتا۔ ہمیں چھوت چھات سے الجھن ہونے کے بجائے مزہ آتا۔ بڑے سہمے ہوئے مؤدب سے الگ الگ رہتے، کچھ ایسا لگتا تھا ہم نے انھیں چھو لیا تو یہ لوگ بھسم ہو جائیں گے۔" "یہ لوگ کافر ہیں" جگنو ہمارے بوجھ بجھکڑ فرماتے۔" اگر ہم

آیت الکرسی پڑھ دیں تو ابھی جل کر خاک ہو جائیں گے۔" (۲۱)

"کاغذی ہے پیرہن" کی گیارہویں اور آخری قسط "روشنی۔ روشنی۔" کے نام سے مئی ۱۹۸۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس میں انھوں نے اپنے لکھنؤ کے قیام کا ذکر کیا ہے۔ جب وہ بی۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وہاں گئی تھیں۔ اس میں انھوں نے لکھنؤ ریلوے پلیٹ فارم اور شہر کی تعریف بھی کی ہے۔ نیز آئی۔ ٹی۔ کالج کے سلسلہ میں بھی اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ بورڈنگ میں عیسائی لڑکیوں کے ساتھ خاص رعایت برتی جاتی تھی، اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ استانیوں کے متعلق بھی اپنی ذاتی رائے پیش کی ہے۔ یونیورسٹی کے کلاس روم کا نقشہ کچھ اس طرح پیش کرتے ہوئے بیان کرتی ہیں:

"یونیورسٹی میں کلاس روم یا لکچر ہال میں اگر لکچر قابل اور زوردار ہوتا تو ایسے محو ہو جاتے کہ ایک دوسرے کے جنسِ وجود کو بھی فراموش کر دیتے۔ ہاں کوئی بور لکچرار ہوتا تو نگاہیں آس پاس بھٹکنے لگتیں اور مانس گند کی فتنہ پردازیاں شروع ہو جاتیں، مگر عموماً ایسا بہت کم ہوتا اور لکچرار چاہے اپنے مضمون پر قدرت نہ رکھتا ہو، اس رویہ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ عموماً یونیورسٹی جب ہی جانا ہوتا تھا جب کوئی مشہور دانشور آتا اور ہم ایسے مسحور ہو جاتے کہ کبھی دھیان نہیں بھٹکا —— لڑکے لڑکیاں معیاری طالب علم ثابت ہوتے۔" (۲۲)

عصمت ایک جگہ اور کالج کے سلسلہ میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

"سال کے خاتمہ پر جب بی۔ اے۔ سینئر کی لڑکیوں کو الوداعی ڈنر دیا گیا تو پھر آئی۔ ٹی۔ کالج کی روایت کے مطابق خوب رنگ جما۔ بہت ہی جذباتی رسم ادا کی گئی —— ہال کا سارا فرنیچر دیواروں سے لگا دیا گیا۔ بیچ میں رخصت ہونے والی لڑکیاں ایک حلقے میں کھڑی ہوتیں اور جن کا آخری سال تھا وہ ان کے پیچھے کھڑی ہوتیں —— اگلی قطار کی لڑکیوں کے ہاتھ میں مٹی کی ہانڈیوں کی رنگ برنگی قندیلیں تھیں۔ جن میں چراغ روشن تھے کالج کے گانوں کے بعد آخری رسم

میں سینئر لڑکیوں نے وہ قندیلیں جونیئر لڑکیوں کو سونپ دیں۔" (۲۳)

عصمت ایک جگہ کتب بینی کے سلسلہ میں لکھتی ہیں:

"زندگی میں سب سے زیادہ مجھے کتابوں نے متاثر کیا ہے۔ مجھے ہر کتاب سے کچھ نہ کچھ ملا ہے۔ اپنی زیادہ تر الجھنوں کا جواب ان ہی میں ڈھونڈا اور پایا ہے۔ کتابیں قریب ترین دوست اور غمگسار ثابت ہوئی ہیں۔ ہزاروں محرومیاں، تاریکیاں ان ہی دوستوں کے سہارے جھیلی ہیں۔ ہر کتاب کے مصنف کو میں نے ایک قسم کا رشتہ دار سا محسوس کیا ہے۔ نام کہاں تک گنواؤں۔ ہارڈی، براؤنٹی سسٹرز سے شروع کر کے برناڈ شا تک پہنچی۔ مگر روسی ادیبوں نے زیادہ متاثر کیا اور جب عقل و ہوش کو کسی راہبر کی تلاش تھی تب ان کتابوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ پولیٹکل، فلاسفی، خشک مضمون رہی اور روسی ادب ذہن کے کونے کونے میں جذب ہو گیا۔ چیخوف کو تو میں آج بھی برکت کے لئے آموختہ کے طور پر پڑھتی ہوں۔ جب کوئی کہانی قابو میں نہیں آتی۔ پتہ نہیں چلتا کہاں سے شروع کروں کہاں ختم کروں تو میں دماغی ورزش کے لئے چند کہانیاں چیخوف کی پڑھ ڈالتی ہوں۔ ایک دم ذہن پر دھار سی رکھ جاتی ہے اور قلم چل نکلتا ہے"۔ (۲۴)

عصمت کی ایک خودنوشت "میری آپ بیتی" کے عنوان سے ان کے افسانوی مجموعے "آدھی عورت آدھا خواب" میں شائع ہوئی ہے۔ یہ مجموعہ جولائی ۱۹۸۶ء میں منظر عام پر آیا ہے۔

اس خودنوشت میں انھوں نے اپنے بچپن سے لے کر طالب علمانہ زندگی اور شادی بیاہ تک کا تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس خودنوشت کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بچپن ہی سے بڑی نڈر اور بے باک واقع ہوئی تھیں۔ وہ خود کو کسی بھی صورت میں لڑکوں سے کم تر نہیں سمجھتی تھیں۔ وہ برابر بھائیوں کی طرح گلی ڈنڈا، فٹ بال، پتنگ بازی اور گھوڑ اسواری بھی کرتی تھیں۔ نشانہ بازی کا بھی شوق تھا۔ انھیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے

ملتا ہے۔ عصمت اپنے طرز تحریر میں جس سچائی کے ساتھ الفاظ پروتی ہیں وہ ان کا رنگ ہے جو دوسروں کے یہاں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ عصمت کی کسی صنف سے متعلق کوئی تحریر ہو فوراً پہچان لی جاتی ہے۔

عصمت نے ہر چند کوئی مفصل اور مکمل سوانح عمری نہیں لکھی، لیکن ان کی جن سوانحی تحریروں کے حوالے دیے گئے ہیں، ان سے ایک افسانہ نگار، ایک عورت اور ایک سماج کے اہم رکن کی شخصیت سامنے آجاتی ہیں۔ ان سوانحی تحریروں سے عصمت کا مطالعہ کرنے والوں کو انھیں سمجھنے میں بھرپور رہنمائی ملے گی۔

باب پنجم

عصمت چغتائی کی مضمون نگاری

مضمون لکھنے کے لئے کسی موضوع کی پابندی نہیں وہ کسی بھی عنوان پر لکھا جا سکتا ہے۔ دراصل مضمون قلبی تاثرات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مضمون نگار کے لئے کسی طرح کی حد بندی نہیں۔ وہ کسی صنفِ ادب پر طبع آزمائی کرے۔ سائنسی علوم پر قلم اٹھائے یا فنون لطیفہ اوراس کے اصناف کے متعلق کچھ لکھے اس کے لئے وہ پوری طرح آزاد ہے۔ اچھے اور بلند مضامین کی خصوصیت ہے کہ یہ ہمارے ذہن کے بند دریچوں کو کھولتے ہیں۔ اچھا مضمون ایک روشن چراغ کے مانند ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ تاریک گوشوں میں اُجالا پیدا کیا اور پھیلایا جاسکتا ہے۔ مضمون نگار کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مطالعے میں وسیع النظری کا فقدان نہ ہو۔ نفسِ تحریر پر مضمون نگار کا جس قدر وسیع مطالعہ اور گہری نظر ہوگی اسی قدر اس کا مضمون معلومات سے پُر اور اثر آفریں ہوگا۔ مختلف عنوانات سے متعلق سیر حاصل گفتگو اور بحث وہی کر سکتا ہے۔ جس کا مطالعہ عمیق ہوگا۔ مطالعہ کی گہرائی اور گیرائی بھی مضمون کو بصیرت افروز بناتی ہے۔ اچھے اور کامیاب مضمون سے ہم بہت کچھ سیکھتے یا پاتے ہیں۔ مضمون نگار کا دیانت دار اور مخلص ہونا بہت ضروری ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہوتی ہے جو مضمون نگار کو کسی تنگ نظری، جانبداری، عجلت پسندی اور تساہلی سے محفوظ رکھتی ہے۔ تنقیدی مضامین میں مضمون نگار کسی موضوع پر حق کی روشنی ڈالتا ہے۔ یہاں وہ حسن وعیب کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے۔ محاسن ومعائب کی عکاسی میں وہ کسی قسم کی رعایت اور مروت کا خیال نہیں رکھتا۔ وہ غیر جانبدار رہ کر بے لاگ اور دوٹوک باتیں لکھتا ہے اور اس اعتماد اور یقین کے ساتھ کہتا ہے جو اس کی دیانت اور اخلاص کی شہادت دیتا ہے۔

عصمت نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں اور سماجی بھی اور ہر جگہ ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ انھوں نے تنقیدی مضامین میں اپنے نقطۂ نظر کی نہ صرف وضاحت کی ہے بلکہ ان کی حقانیت پر اصرار بھی کیا ہے، انھوں نے خواتین کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اس لئے جب وہ خواتین کے مسائل سے بحث کرتی ہیں تو ان میں بھی وہ ایک حقیقت نگار کے پیکر میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ وہ صرف ناول نگار یا افسانہ نگار نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر ایک نقاد

کا دل دھڑکتا ہے۔

ان کے دو مضامین ان کے افسانوں کے مجموعے 'ایک بات' میں شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مضمون 'ایک بات' کے عنوان سے ہے اور دوسرے کا عنوان 'ہیروئن'۔

ایک بات انھوں نے ان لوگوں کے اعتراضات کے جواب میں تحریر کیا ہے جو لوگ نئے ادب کو گندہ، مخرب اخلاق اور فحش کہہ کر اسے اپنی تنقید کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ عصمت چغتائی نے ان کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے اس مضمون میں لکھا ہے کہ

> ''مگر یہ بھی تو غلط ہے کہ نئے ادب میں صرف عریانی ہی ہے۔ وہ مثل ہے نا کہ جیسی روح ویسے فرشتے۔ چند اصحاب نے صرف عریانی کو پڑھا اور وہ ان کے دل و دماغ پر نقش کر گئی مطلب کی باتیں معلوم ہی نہ ہوئیں۔ لہٰذا نظر انداز کر دیں مگر یقیناً عریاں جملے سو سو بار رٹے۔ ذرا غور کیجئے، عریانی پڑھنے کے شوقین تو معصوم بن کر چھوٹ جائیں اور لکھنے والا برا۔'' (۱)

نئے ادب کو موجودہ زمانہ کی تاریخ بتاتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ نئے ادیب تو وہی کچھ لکھ رہے ہیں جو آج کی دنیا میں ہو رہا ہے۔ ادیب تو مصور ہوتے ہیں۔ ماحول اور سماج میں جیسا کہ دیکھتے ہیں اسی کی تصویریں ادب میں پیش کر دیتے ہیں اس لئے جیسا سماج ہوگا اور جیسی دنیا ہوگی ویسی ہی ان کی پیش کی ہوئی تخلیق بھی ہوگی۔ اب اگر ماحول گندہ ہے۔ سماج گندہ ہے اور دنیا گندی ہے تو اس میں ادیبوں کا کیا قصور ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''........وہ تو صرف حروف میں انھی باتوں کو منتقل کر رہا ہے جو دنیا میں ہو رہی ہیں۔ نیا ادب موجودہ زمانہ کی تاریخ ہے برسوں بعد بھی جب یہ نیا ادب نیا نہ رہے گا۔ تب بھی اسی طرح سیاسی اقتصادی اور معاشرتی حالات کے متعلق تاریخی مواد پہنچاتا رہے گا۔ یہی کہانیاں اور نظمیں تاریخ کے صفحات میں تبدیل ہو جائیں گی۔ اگر نیا ادب گندہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نئی دنیا گندی ہے، جس کی یہ تصویر ہے۔ مصور کا کیا قصور؟'' (۲)

کچھ لوگوں کو اعتراض تھا کہ نئے ادیب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ انھیں بھی جواب دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

''تاریخ اور ادب ساتھ ساتھ رہے ہیں اور رہیں گے۔ اقتصادیات کو بھی ادب سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ خواہ سیاسی مجبوریاں ادب کو سیاست سے دور رکھیں۔ پھر بھی دبا چھپا رنگ پھوٹ ہی نکلے گا۔ اس نئے ادب سے پہلے رومان اور مزاح کا رنگ تھا۔ پطرس۔ عظیم بیگ۔ رشید احمد۔ شوکت تھانوی۔ امتیاز علی تاج۔ فرحت اللہ بیگ سب ہی تو کم و بیش ایک ہی سا لکھتے تھے۔ ذرا غور سے پڑھئے۔ وہی بیوی کے مظالم دوستوں کی خوش مذاقیاں۔ گھریلو جھگڑے سب کا رنگ جدا تھا اور اب نئے ادیب کیا لکھ رہے ہیں۔ جنسی الجھنیں، امیر و غریب کے جھگڑے زندگی سے جنگ اور جملہ دنیا کی تلخیاں! یہ تو ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔ پھر نئے ادیبوں سے کیوں شکایت ہے کہ وہ سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ کس قدر فضول نقص ہے ارے صاحب ملیریا پھیلتا ہے تو سب کو کونین ہی دیتے ہیں۔ دکھ درد میں سب انسان ایک ہی طرح روتے پیٹتے ہیں۔ کوئی گاتا تو ہو نہیں رہا جو سُر تال میں ہو پرانا ادب بھی زندگی کی تصویر تھی اور نیا ادب بھی۔ یہ مانا کہ جب پُرانا ادب لکھا گیا تو یہ دنیا اتنی گندی اور عریاں نہیں تھی اور اب آپ جدھر نظر اٹھا کر دیکھئے دنیا ننگی، بھوکی، چور اچکی اور مکار نظر آتی ہے۔ نئے ادیب کیا کریں۔ کیسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر گل بکاؤلی اور مثنوی گلزار نسیم لکھنے لگیں''۔ (۳)

عصمت چغتائی مزید لکھتی ہیں:

''.......... ہندوستان کے لوگ غریب ہیں — اکثر نادار ہیں، ناداری میں شادی مصیبت — ناداری میں عیاشی گناہ — ناداری میں جینا منع کیوں؟ آخر کیوں؟ نوجوان باوجود تعلیم اور جسمانی قابلیت رکھنے

کے دنیا کی دلچسپیوں سے محروم۔ علم تو الٹا ہمارے لئے مصیبت ہو گیا
کہ نہ پڑھتے نہ یہ معلوم ہوتا کہ دنیا کے دوسرے انسان کیا مزے
اڑا رہے ہیں۔ مزے سے اپنی چٹری میں مگن رہتے مگر اب ہم جانتے
ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اور ملکوں میں زندہ رہنا جرم نہیں اور یہاں کے
نو جوانوں کو کچھ بھی نصیب نہیں۔ یہاں ہر بات عیب، ہر بات گندی،
عریاں اور مخرب اخلاق۔ وہاں عیش کے ہزاروں اسباب، یہاں زندگی
کے خواب دیکھنا جرم!...... مگر نئی دنیا کا نیا بیٹا ضدی، بدمزاج اور اکھڑ
ہے۔ وہ موجودہ نظام کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک نئے نظام کے لئے
بکل ہے۔ وہ اسے بدل ڈالنا چاہتا ہے مگر ابھی وہ بدنظمی سے متنفر،
غصہ ہو ہو کر اپنی ہی بوٹیاں چبا رہا ہے۔ خود اپنا ہی جسم اور روح چیر کر
پھینک رہا ہے اور کل وہ اس نظام کو توڑ پھوڑ کر دوسرا نظام بنائے گا مگر
اس نظام کو توڑنے سے پہلے اسے نہ جانے کس کس کو کچلنا پڑے گا۔
کس کس کے پیروں سے روندا جائے گا— اور جو باقی رہے گا وہی
نئے نظام کی تکمیل کرے گا—
یہ نظام کیا ہو گا؟ یہ ابھی کسی کو نہیں معلوم نئے ادب کے پڑھنے سے
اندازہ ہوتا ہے کہ اس نئے نظام میں دکھ، بھوک اور افلاس تو نہ
ہو گا— فاقے— جنسی اور روحانی نہ ہوں گے، بدمعاشی نہ ہوگی۔
طوائفوں کے اڈے نہ ہوں گے اگر ہوں گے تو صرف انسانوں کے
گھر ہوں گے جہاں انسان رہے گا۔" (۴)

نئے ادیبوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"......ان فضول طعنوں کی پروانہ کیجئے یہ اعتراض کب نہیں
ہوئے؟ کس نے نہیں کئے؟ سوائے دادی اماں کے لاڈلے بیٹوں
کے کون ایسا ہے جس نے کبھی بزرگوں سے شاباشی وصول کی ہو؟
نوجوانی سے بزرگوں کو ہمیشہ نفرت رہی ہے اور رہے گی۔ سچ تو یہ ہے

کہ آپ جو کچھ لکھتے ہیں یہ بزرگوں کے لئے ہے بھی نہیں۔ کچھ کہیں
تو ادب سے سر جھکا کر مسکرا دیجئے۔ لکھئے ضرور لکھئے۔ جو کچھ آپ
دیکھتے ہیں۔ سنتے ہیں، سوچتے ہیں وہ ضرور لکھئے۔ نہ زبان کی غلطیوں
سے ڈریئے نہ اس بات سے ڈریئے کہ کوئی آپ کو ادیب نہیں مانتا۔
اگر آپ جس دنیا میں رہتے ہیں۔ اس میں کچھ مسموم کانٹے ہیں کچھ
بھیانک درندے ہیں۔ کچھ خوفناک کیڑے مکوڑے ہیں تو آئندہ نسل
کے لئے اسے لکھ جائے۔ اس کا سبق آپ کے ہی تجربے ہوں گے۔
آپ کے ہی مشاہدے ان کے ذہنی مشاہدات ہوں گے۔ اچھا برا
کڑوا کسیلا سب کچھ لکھ دیجئے اور وہ خوراکیں جو ہمارے شریر مریض
پینے سے انکار کر رہے ہیں اور بے طرح مچلے جاتے ہیں آئندہ نسلیں
انھیں فخریہ احترام سے لیں گی۔ کیونکہ آئندہ نسل زیادہ سمجھدار روشن
دماغ اور اچھے برے کو پرکھنے والی پیدا ہوگی۔ اس کے لئے یہ خوراکیں
بھاری ہوں گی ...... اس کے جذبات اس قدر بودے نہ ہوں گے جو
عریانی اور ننگی بات سے پھڑ پھڑا جائیں ...... لکھئے اور اتنا لکھئے کہ یہ
ان کے لئے بالکل معمولی بات ہو جائے اور ان جراثیم کو اپنے تیزاب
جیسے ادبی مادے سے تیار کر دیجئے اور یہی روئی کے گالے جن میں
ایک چنگاری بھی پڑ جائے تو بھک سے اڑ جاتے ہیں، برف کے گالے
بنا دیجئے جن میں انگارے بھی سرد پڑ جائیں''(۵)

عصمت مضمون کے آخر میں نیا ادب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

''......... اور وہ دن دور نہیں جب اس ادب کا ریزہ ریزہ لوگ پلکوں
سے چُن لیں گے۔ مورخین اکونمسٹ اور محکمہ تعلیم والے اس کو جمع
کرلیں گے۔ اگر یہ موجودہ ادب موجودہ زمانہ کی سچی تصویر ہے تو
خود بخود عجائب خانہ کی زینت بن جائے گا اور اگر کوڑا کرکٹ ہے تو
اپنے راستے لگ جائے گا ـــ ہمیں کیا فکر؟''(۶)

اپنے مضمون" ہیروئن" میں انھوں نے کہانیوں اورافسانوں میں ہیروئن کی کیا حیثیت ہوتی ہے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس ادب میں ہیرواور ہیروئن نہیں وہ ادب خشک ستو کے مصداق ہے۔ وہ اس سلسلہ میں تحریر فرماتی ہیں:

"......یوں تو ایسا ادب بھی ہے جس میں ہیرواور ہیروئن نہیں۔وہ ادب بھی ایسا ہی جیسے کسی نے ایک ہاتھ اور پیر کے تلوے کی مدد سے تالی بجادی ہو۔ایسی تالی بج تو گئی مگر کتابوں کی جلدوں ہی میں گونج کر رہ گئی عوام تک اس کی رسائی نہ ہوسکی اور اگر سارے ادب میں ہیروئن اور ہیرو نہ ہوتے تو یقیناً یہ خشک ستو بن کر حلق میں پھنس جاتا۔"(۷)

ایک جگہ اور اس ضمن میں بیان کرتی ہیں:

"........علامہ راشد الخیری اور پریم چند جی اگر ہیرو ہیروئن کے کندھوں کا سہارا نہ لیتے تو آج بجائے لوگوں کے دل و دماغ کے صرف بوسیدہ کتب خانوں میں پڑے اُونگھ رہے ہوتے۔ادب اور زندگی۔ادب اور سماج۔ادب اور تاریخ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو دونوں مٹ جائیں گے۔دوسرے معنوں میں اگر ادب سے زندگی یعنی ہیرواور ہیروئن کو الگ کردیا جائے تو ایک خلارہ جائے گی"۔(۸)

اس مضمون میں انھوں نے مختلف کہانی کاروں کی ہیروئنوں کا تعارف بھی کرایا ہے۔ایک جگہ اس سلسلہ میں تبصرہ کرتی ہیں:

"تو یہ ہوئی ہیروئن، سرشار کی نازوادا بھری، نازنین، جسے دنیا میں سوائے کھانے پینے اور عیش کرنے کے، کسی بات کی فکر نہیں — میں نے غلط کہا۔ایک بات کی بے انتہا فکر ہے اور وہ عشق لڑانے کی—یہ زمانہ ہے فارغ البالی کا، پھر اس کے مقابلے میں پریم چند کی مظلوم عورت اور راشد الخیری کی کچلی ہوئی بیوہ یہ زمانہ ہے اقتصادی کش مکش

کا اور سدھار کا۔ پھر لیجئے مزاج نگاروں کو — یہ ہنس گئے اور ہنسا گئے
چمڑی میں مگن، نہ آگے جانا نہ پیچھے ہٹنا — پھر ایم اسلم کی ساحو کی
لڑکی جسے سوائے ندی کے کنارے آنے جانے والوں سے پریم کی
پینگیں بڑھانے اور بھونروں کے ساتھ گیت گانے کے اور کوئی کام
نہیں۔ مس حجاب کی بیوقوف، کاہل اور بے مصرف دوشیزہ جسے سوائے
چوہوں سے ڈر کر بیہوش ہو جانے کے اور کچھ نہیں آتا۔ جہاں حسن و
عشق کو بناوٹ نے اُلو بنا رکھا ہے۔ یہ زمانہ ہے عاجز آ کر اوکھنے کا،
اور پھر کرشن کی زندہ عورت، بیدی کی کاروباری ہیروئن، منٹو کی جیتی
جاگتی سب کی جانی پہچانی بے حیا رنڈی۔ عصمت کی بے چین، منہ
پھٹ اور بے شرم لڑکی۔ ستیارتھی کی خانہ بدوش عسکری کی فلسفی میم
صاحب۔ یہ زمانہ ہے زندہ رہنے کے لئے لڑ مرنے کا۔ کچھ تعمیر
کرنے کے لئے دین دنیا کو تلپٹ کر دینے کا۔ جیسا کہ موجودہ فضا
سے ظاہر ہو رہا ہے۔''(۹)

عصمت مضمون کے آخر میں لکھتی ہیں:

''...... ہماری آئندہ زندگی کی ہیروئن کس شان سے جلوہ افروز ہوتی
ہے۔ خدا کے بعد عورت ہی کی پرستش ادب میں کی گئی ہے یا شاید اس
کا نمبر پہلے آتا ہے اور پھر دنیا کی دوسری طاقتوں کا جہاں تک اندازہ
کیا جاتا ہے۔ آنے والی ہیروئن نہ تو ظالم ہوگی نہ مظلوم۔ بلکہ صرف
ایک عورت ہوگی اور اہرمن و یزداں کے بجائے ادیب اسے عورت کا
رتبہ ہی بخشیں گے اور پھر تعمیر شروع ہوگی۔''(۱۰)

عصمت چغتائی کے افسانوں کے مجموعے ''چھوئی موئی'' میں ان کے پانچ مضامین
شامل ہیں۔ پہلے مضمون کا عنوان ہے'' کہانی '' اس میں انھوں نے کہانی کے موضوعات پر
روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ پرانے زمانے میں جو کہانیاں لکھی جاتی تھیں ان کے بیشتر
موضوعات عشق و محبت ہی کے رہین منت تھے۔ اس کے ہیرو شہزادے اور ہیروئن شہزادیاں

ہوا کرتی تھیں۔لیکن وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بادشاہ زادے کا کردار افسانوں اور کہانیوں کا مخصوص حصہ نہ رہ گیا اور اب ان کی جگہ جاگیرداروں اور زمینداروں کا زمانہ آیا تو کہانیوں کے ہیرو زمیندار اور زمیندار زادے بنے۔ان کا مشغلہ بھی عشق بازی ہی رہا۔ بقول عصمت:

''اور پھر دنیا کی قلابازیوں سے بدحواس ہوکر ہیرو زمیندار بنا۔ پھر لُٹ کھسٹ کر سیدھا سادا انسان رہ گیا۔لوٹ پوٹ کر جب یہ ہیرو شہزادے سے انسان بنا تو بھی اس نے وہ اپنا پرانا پیشہ نہ چھوڑا۔ سوائے عشق اور دھندا ہی کچھ نہیں۔'' (۱۱)

اس طرح دیکھا جائے تو عشق تمام کہانیوں کا لازمی حصہ رہا۔بغیر عشق کے کوئی کہانی مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔عصمت کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''کوئی کہانی کوئی قصہ جب تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہیرو کسی ہیروئن پر عاشق نہ ہو جائے اگر وہ کلرک ہے تو مینیجر کی لڑکی کے موٹر کی خاک پھانکے۔اگر طالب علم ہے تو پروفیسر کی لڑکی یا اور کسی طالبۂ علم کا دُم چھلّا بن جائے مزدور ہے تو سیٹھ کی بیٹی کی بانکی چتون کا شکار ہوجائے۔'' (۱۲)

لیکن زمانہ کے تغیر کے ساتھ ساتھ انسان کی زندگی نت نئے مسائل میں الجھتی چلی گئی۔لوگوں کو بھوک، بے کاری اور بے روزگاری کا جب شدت کے ساتھ احساس ہوا تو عشق کو خود اپنا راستہ تلاش کرنا پڑا۔کہانی کے موضوعات میں بھی تبدیلی آئی،ساتھ ہی ساتھ کہانی کے ہیرو اور ہیروئن بھی تبدیل ہوئے عصمت کے الفاظ میں:

''زندگی ہے کہ طوفان بے تمیزی۔کوئی کیا کہانی لکھے؟ ہیرو منہ پھلائے بیٹھا ہے۔آہیں بھر بھر کے اس کا سینہ دھونکنی کی طرح پھول گیا ہے کیونکہ پیٹ کا تنور ٹھنڈا پڑا ہے۔عشق تو دُم دبا کر بھاگ چکا ہے اور زندگی نیم بسمل کبوتر کی طرح پھڑپھڑا رہی ہے۔کہتے ہیں ایک دفعہ دمشق میں بھی ایسا کال پڑا تھا کہ عاشق و معشوق چوکڑی بھول گئے

تھے۔تو کیا ہندوستان کا جذبۂ عشق اس خون کی برسات سے دھندلا بھی نہیں پڑا ہوگا۔ضرور پڑی ہوگی اوس جبھی تو ہیرو ایسا سنگدل ہو گیا ہے کہ لاٹھی چارج اور تنگی نے تیر نظر سے گھائل ہونے کی سکت ہی نہیں چھوڑی ہے۔وہ اکتایا ہوا کہہ رہا ہے۔اے دوشیزہ تمہارے ڈھلکتے آنچل میری زندگی کو روندتی ہوئی چٹانوں سے نہیں ہٹا سکتے۔ مجھے شراب الفت پلانے کی بجائے اصلی دودھ کی دو گرم گرم چائے کی پیالیاں پلا دو تو بڑا کرم ہو۔" (۱۳)

عصمت اس سلسلہ میں مزید لکھتی ہیں:

"ہیروئن الگ بال بکھرائے ٹسوے بہا رہی ہے۔بہت دن تک تم میرے حسن کے جھوٹے گیتوں سے اپنے ہونٹوں کو آلودہ کرتے رہے اب میرے کان پک گئے سنتے سنتے تم جھوٹے ہو۔تمہارا فلسفہ جھوٹا۔میرے ہونٹ جنہیں تم گل برگ تر کہتے ہو۔کانوں سے بھی زیادہ خشک ہیں۔میں نے آج تک کسی پر نین بان نہیں چلائے۔ کیونکہ میری آنکھیں تو بچپن ہی میں دکھ دکھ کر چندھیا چکی ہیں اور پلکیں پڑبال سے جھڑ چکی۔میری پھٹی چولی میں سے جھلکتے ہوئے نیم مردہ گوشت کو دیکھ کر ذہنی چٹخارے نہ لو۔اس میں کھجلی اور جوؤں نے گھاؤ ڈال دیے ہیں کہاں ہیں گدرانار اور پکے امرود۔تین دن سے ننھا بھوک سے بلبلا رہا ہے۔نہ گاؤ میری عصمت اور تقدس کے نغمے کہ میں سڑک کے بیچوں بیچ دلہن بن چکی ہوں مجھے عشق ومحبت کی گھات میں جھروکوں میں نہ بٹھاؤ میرے ہاتھ میں بیلچہ دے دو۔ ایک ہاتھ سے میں ننھے کا پنگورا جھلاؤں گی اور دوسرے سے دھان کوٹوں گی۔پھر بھی میرے لب تمہارے بوسوں کے لئے خالی رہیں گے۔اس فکر میں کیوں گھلے جاتے ہو۔ذرا ایک بار حسن و عشق کے بوسیدہ بستر سے اٹھا کر مجھے اپنے پاس کھڑا تو کرلو،پھر دیکھنا۔پھر بھی

اگر آپ کو میرا یقین نہیں آتا تو کرشن سے پوچھئے کہ کیوں اس کی چمپا کلی سے زیادہ نازک اور مہکتی دوشیزہ ''پشاور میل'' بن کر دندنانے لگی اور کیوں اس کا مرگھلا، روتا بسورتا مجنوں تین غنڈے ''بن بیٹھا'' اور اس کے ''نظارے'' پکار پکار کر کہتے ہیں کہ ''ہم وحشی ہیں'' عباس سے پوچھئے وہ بتادے گا کہ کیوں اس کی ''ایک لڑکی'' کی رعنائیاں ''اجنتا'' کی بے جان چٹانوں میں منجمد ہو کر رہ گئیں سردار جعفری سے پوچھئے کہ کیوں اس کا سرنئی دنیا کے سلام کو بے ساختہ جھک گیا'' (۱۴)

عصمت مضمون کے آخر میں لکھتی ہیں:

''اور کیوں ہر قلم خون کے آنسو رو رہا ہے۔ کیوں کاغذ کا پُرزہ پُرزہ فرطِ الم سے لرزاں ہے۔ ہر اخبار اور رسالے کے سینے میں شعلے کیوں لپک رہے ہیں اور کیوں ہر کتاب کے صفحوں میں چنگاریاں دبی دبی سلگ رہی ہیں۔

انسانیت شیطانیت سے پٹ کر رو رہی ہے۔ حسن وعشق ایک دوسرے کی موت پر گلے مل مل کر ماتم کر رہے ہیں۔

تو میں کیسے کہانی لکھوں؟ کہانی کے لئے مسالہ کہاں؟'' (۱۵)

''فسادات اور ادب'' بلند مضامین کی فہرست میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے تقسیم ہند کے بعد ملک میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کا تجزیہ کیا ہے۔ ملک جب تقسیم ہوا تو اپنے ساتھ مختلف قسم کی تباہیاں بھی لایا انسان اس قدر سفاک اور ظالم بن گیا کہ انسانیت چیخ اٹھی۔ ملک کے بٹوارے کے ساتھ ہی لوگوں کے دل و دماغ بھی منقسم ہو گئے۔ خاندان تقسیم ہو گئے۔

بقول عصمت چغتائی:

''فسادات کا سیلاب اپنی پوری خباثتوں کے ساتھ آیا اور چلا گیا مگر اپنے پیچھے زندہ مردہ اور سسکتی ہوئی لاشوں کے انبار چھوڑ گیا۔ ملک کے ہی دو ٹکڑے نہیں ہوئے جسموں اور ذہنوں کا بھی بٹوارہ ہو گیا۔

قدریں بکھر گئیں اور انسانیت کی دھجیاں اڑ گئیں۔ گورنمنٹ کے افسر، دفتروں کے کلرک مع میز کرسی قلم دوات اور رجسٹروں کے مال غنیمت کی طرح بانٹ دیے گئے اور جو کچھ اس بٹوارے کے بعد بچے ان پر فسادات نے دست شفقت پھیر دیا جن کے جسم سالم رہ گئے ان کے دلوں کے حصے بخرے ہو گئے۔ ایک بھائی ہندوستان کے حصے میں آیا تو دوسرا پاکستان کے۔ ماں ہندوستان میں تو اولاد پاکستان میں۔ میاں ہندوستان میں تو بیوی پاکستان میں۔ خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ زندگی کے بندھن تار تار ہو گئے، یہاں تک کہ بہت سے جسم تو ہندوستان میں رہ گئے اور روح پاکستان چل دی۔

فسادات اور آزادی کچھ اس طرح گڈمڈ ہو کر وارد ہوئے کہ یہ قیاس لگانا دشوار ہو گیا کہ کون سی آزادی ہے اور کون سا فساد۔ لہٰذا جس کے حصے میں آزادی آئی فساد آگے پیچھے لائی۔ ایک بار ہی طوفان کچھ اس طرح بے کہے سنے وارد ہوا کہ لوگ بستر بوریہ بھی نہ سمیٹ سکے۔ جب ذرا ٹھنڈک پڑی تو جملہ حواس جمع کر کے چاروں طرف دیکھنے کا موقع ملا۔" (۱۶)

اس بٹوارے نے ہندوستان پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں کے اذہان کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ عصمت چغتائی کے مطابق:

"جب زندگی کا کونہ کونہ اس بھونچال کی عنایت سے تلپٹ ہو چکا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ شاعر اور ادیب الگ تھلگ بیٹھے رہتے، جب زندگی خون میں غلطاں ہو گئی تو پھر ادب جس کا زندگی سے چولی دامن کا رشتہ ہے کہاں تک تر دامنی سے بچ سکتا تھا۔ لہٰذا ہجر و وصال کے جھگڑے بھول بھال کر لوگ ہڈی پسلی کے بچاؤ کی فکر میں پڑ گئے۔ شیطان کے چیلوں کے انداز دو چار ہاتھ انداز معشوقانہ سے بھی آگے نکل گئے۔ پناہ گزینوں کے قافلوں نے قیس و فرہاد کی صحرا نوردی پر خاک ڈال

دی۔ یہاں تک کہ غزل بھی جسے جاگیرداری کی ناز پروردہ کہا جاتا ہے
چوکڑی بھول کر کوچۂ جاناں سے نکل بھاگی اور جلے ہوئے بازاروں
لٹے ہوئے مکانوں اور کچلی ہوئی انسانیت کے انباروں میں بھٹکنے لگی۔
اس کے سوا چارہ بھی تو نہ تھا۔ ''آخر غم جاناں کو ایک دن بڑھ کر غمِ دوراں
ہونا تھا۔'' (۱۷)

تاہم کچھ لوگ ایسے تنگ نظر ہیں جو فسادات پر لکھی ہوئی تخلیقات کو ہنگامی ادب اور وقتی پروپگنڈا کا نام دے کر خاموش رہتے ہیں، ایسے لوگوں کو جواب دیتے ہوئے عصمت چغتائی لکھتی ہیں:

''وہ لوگ جو فسادات پر لکھے ہوئے ادب کو ہنگامی ادب اور وقتی پروپگنڈا
کہہ کر اس کی وقعت کم کرنا چاہتے ہیں وہ زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو
خود کچھ نہ لکھ سکے یا شاید اس ادب کو اپنے مطلب کے خلاف پا کر
اسے گمنامی سے ڈرا کر میدان صاف کرنا چاہتے ہیں۔ ادب کی فنا اور
بقا۔ نفسِ مضمون اور ادیب کی صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ اس ادب کو وقتی
ادب کہنا تنگ نظری کی دلیل ہے۔

اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہر ہنگامہ غیر فانی ادب پیدا کر سکتا ہے
مثلاً اگر کسی نواب صاحب کے لاڈلے کتے کی شادی پر سہرا لکھا جائے
یا کسی کلکٹر صاحب کے تبادلے پر شہر کے ہیڈ ماسٹر صاحب الوداعی
مرثیہ لکھ دیں تو وہ بھی غیر فانی ہو جائے گا۔ غیر فانی ادب کو پیدا کرنے
کے لئے ایک حساس دل کی ضرورت ہے اس طرف جہاں کی کوئی
منزل ہو۔'' (۱۸)

''کدھر جائیں؟'' عصمت چغتائی کا ایک تنقیدی مضمون ہے جو عبادت بریلوی کے ایک مضمون کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ عبادت صاحب کا یہ مضمون ''نقوش'' میں چھپا تھا۔ اس مضمون کا اقتباس درج ذیل ہے۔ جس سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس مضمون میں انھوں نے کیا لکھا تھا۔

''انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہونے کے لئے کبھی بھی کمیونسٹ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ آج بھی نہیں ہے آئندہ بھی نہیں ہوگی۔ اس میں ہر سیاسی خیال کے لوگ شریک ہو سکتے ہیں، البتہ اس میں شریک ہونے کے لئے چند بنیادی باتوں پر ان کا متفق ہونا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ انسانیت کی قدروں کو آگے بڑھانے میں مدد کریں گے۔ جبر واستبداد کی مخالفت ان کا فرض ہوگا۔ سرمایہ دارانہ نظام نے سماجی زندگی میں جو افراتفری مچا رکھی ہے۔ جو ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اس کو فنا کرنا ان کے نزدیک از بس ضروری ہے۔ آزادیٔ تحریر وتقریر ان کے نزدیک انسان کا بنیادی حق ہے اگر ایسا نہ ہو تو انہیں اس کے لئے جد وجہد کرنی چاہئے۔ اگر حکومت اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لئے ادب اور تہذیب، کلچر اور سماج کی چھاتی پر مونگ دلتی ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ ایسی حکومت کی مخالفت کریں۔ دنیا میں جو سرمایہ دارانہ قوتیں اپنے جال پھیلا کر عوامی اور انسان دوست طاقتوں کو اسیر کرنا چاہتی ہیں، ان کے خلاف آواز اٹھانی ترقی پسند ادیبوں کے نزدیک لازمی ہے، وہ اپنے ملک میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کے مظاہرے نہیں چاہتے، وہ صحیح معنوں میں عوام کی حکومت کے خواہاں ہیں۔ عوام کی زندگی کو بلند کرنا ان کے پیش نظر ہے، ان کے لئے یہ ضرورت نہیں کہ وہ کاٹ پیچ کی باتوں کو پوری طرح سمجھ سکیں، حالات کا صحیح جائزہ لے سکیں اور عوام کے نقطۂ نظر کی ترجمانی ان کے حق کا حصہ بن سکے۔ اگر ان بنیادی باتوں سے کوئی ادیب اتفاق رکھتا ہے تو وہ ترقی پسند ہے، وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا ممبر ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے سیاسی جماعت سے وابستہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ فروعی باتوں میں اختلافات کے باوجود مختلف ادیب انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہوسکتے ہیں، لیکن ان بنیادی باتوں پر ان سب کا متفق ہونا ضروری

ہے جن کا بیان اوپر کیا جا چکا ہے''۔(۱۹)

عصمت چغتائی عبادت بریلوی صاحب کے اس مضمون پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ عبادت صاحب وہی کہتے ہیں جو کمیونسٹ کہتے ہیں۔ مثلاً ہم ترقی پسند ہیں، انسان دوست ہیں عوام کے ساتھ ہیں، سرمایہ داری کے دشمن ہیں۔ انقلاب کے علمبردار ہیں، اشتراکیت کو سیاسی مشکلات کا حل سمجھتے ہیں لیکن ہم کمیونسٹ نہیں ہیں۔ عبادت صاحب ترقی پسند تو بننا چاہتے ہیں لیکن کمیونسٹ کہلوانا پسند نہیں کرتے انھیں اشتراکیت کے بعض اصولوں سے اختلاف بھی ہے۔ جسے اشتراکیت کے اصولوں سے اختلاف ہوگا تو وہ ترقی پسند کیسے کہا جائے گا۔ عبادت صاحب کے اس قول کی بھی سخت تردید کی ہے کہ ترقی پسند انجمن میں ہر سیاسی پارٹی کے آدمی رہ سکتے ہیں، چاہے وہ لیگی ہوں یا مہا سبھائی، نیشنل گارڈ ہو یا آر ایس ایس یا فاشسٹ۔ اس کا جواب دیتے ہوئے عصمت لکھتی ہیں:

''......مگر یہ ہو کیسے سکتا ہے۔ ایک شخص بیمار بھی ہو اور تندرست بھی۔ جھوٹا بھی ہو اور سچا بھی۔ الٹا بھی اور سیدھا بھی ہو۔ آپ لاکھ بلائیں ''ہر سیاسی پارٹی'' کا فرد جس کا پروگرام جدا ہے۔ وہ انجمن میں آنے ہی کیوں لگا۔''(۲۰)

اس طرح ان کی اور دوسری باتوں مثلاً سیاست گندی چیز ہے اور ادبی اشتراکیت اور اشتراکیت کے کارکنوں میں فرق ہے۔ اس پر بھی انھوں نے سخت تنقید کی ہے۔ انھوں نے بڑے سخت الفاظ میں لکھا ہے:

''عبادت صاحب کیا ہمیں احمق سمجھتے ہیں؟ کیا ہم سیاست کے معنی بھی نہیں سمجھتے۔ سیاست میں غرق ہونے کے لئے یہ لازمی تو نہیں کہ نعرے لگائے جائیں، جھنڈے اٹھائے جائیں اور ٹریڈ یونین کا ممبر بنا جائے۔ قلم میں طاقت ہے تو بغیر سڑک پر جائے اسٹرائک کروا سکتے ہیں۔ ریلوں کے تو کیا حکومت کے پہیہ کو جام کر سکتے ہیں۔ لیکن فرق ہی کیا ہوا۔ ریل کا پہیہ چاہے تحریر سے جام ہوا یا ہاتھ کے کسی رگ و پٹھوں سے۔ بات تو وہی ہوئی۔ اس میں اتنے داؤں پیچ دکھانے کی

کیا ضرورت ہے۔'' (۳۱)

اور آخر میں عصمت لکھتی ہیں

''عبادت صاحب کی اس تنقید سے ان لوگوں کے دل پر کیا اثر ہوا ہوگا جو مورچوں پر لڑ رہے ہیں جو حکومت کے ہتھکنڈوں کا پہیہ جام کئے دے رہے ہیں جو ڈالر کے پہاڑ ڈھائے دے رہے ہیں اور فاشزم کے بیخ کنی کر رہے ہیں یا ان لوگوں سے ان کا اور ترقی پسند مصنفین کا کوئی ناتہ نہیں۔ اگر نہیں تو پھر کھلے بندوں اعلان کیجئے۔ اب نعرے بازی کا وقت نہیں اب ہمیں ہر نعرے کی تشریح بھی کرنا ہوگی اپنے ہر قدم اور فعل کا حساب دینا ہوگا۔ ایک دوسرے سے اگر سوال مانگا جائے تو اسے الزام لگانا ذاتی پرخاش کی بنا پر حملہ کرنا یا پارٹی بندی کی پالیسی کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا برا ماننے سے بھی کام نہ چلے گا۔ دلائل سے قائل کرنا پڑے گا ورنہ صاف کہہ دیجئے۔

''ابھی فضا سازگار نہیں ذرا آہستہ چلو راستے میں روڑے ہیں۔'' مگر ساتھ ساتھ یہ بھی لکھئے گا کہ کس سال کس مہینے کس دن اور کون سی گھڑی فضا سازگار ہو جائے گی۔ یہ روڑے آپ سے آپ راستے سے کھسک جائیں گے کہ انقلاب مزے مزے ٹہلتا ہوا چلا آئے گا اور اس مبارک گھڑی کے انتظار میں اتنے دن ہم آسمانوں سے بلند چرخ نیلی سے بھی آگے افیون کا آنٹا نگل کر تارے گنتے رہیں کہ کچھ اور بھی کریں۔ لیکن اگر عبادت صاحب کی رائے ہے کہ بھئی ذرا گول مول پروگرام رکھو۔ تھوڑی لگی لپٹی کہو کہ ادیب برا نہ مان جائیں تو جناب مجھے ان برا ماننے والوں سے بڑی نفرت ہے ...... جو کوئی بھی انجمن میں شریک ہونے کے لئے شرطیں لگاتا ہے اسے ان شرطوں کا محاسبہ دینا ہوگا۔ اگر ان کی شرطیں احمقانہ ہوں گی تو ان کا پورا کرنا انجمن کا کام نہیں۔ آج ایک بہانہ کرتے ہیں کل سو بہانے کریں گے انجمن کب

تک ان کے نخرے سہے گی اور کیوں؟ کیا مستقبل سے ہم اتنے ناامید ہو چکے ہیں؟ کیا ادب بانجھ ہو جائے گا؟ اور نئے ادیب پیدا ہی نہ ہوں گے۔ جو ہم موجودہ ادیبوں کی خاطر انجمن کے منشور کو توڑ مروڑ کر نئی نئی پھلجھڑیاں لگائیں۔ ہمارے آج کے فیصلوں سے ہمارے ادب کا مستقبل وابستہ ہے۔ اسی پر ہماری آئندہ پالیسی کا انحصار ہے۔ اگر ہم نے فراخ دلی سے ان الجھنوں اور غلط فہمیوں کو نہ سلجھایا تو آئندہ ہمیں عجیب عجیب پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہمارے نظریات جب تک واضح نہ ہوں ہماری تحریریں بھی جب تک گول مٹول رہیں گی اور ابھرنے والے نئے ادیب ان غلط فہمیوں کا شکار بن کر ادب کی صورت کو اور بھی مسخ کر دیں گے یہ مسئلہ اتنا سطحی نہیں جتنا عبادت صاحب کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس کی روشنی میں انجمن کے نئے منشور کا حلیہ ایسا بگڑ جاتا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا'' (۲۲)

چوتھا مضمون ''پوم پوم ڈارلنگ'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں عصمت چغتائی نے قرۃ العین کی افسانہ نگاری اور ان کے افسانوں کے اسلوب، کردار اور موضوعات پر سخت تنقید کی ہے۔ عصمت کی تحریر میں:

''جب قرۃ العین کا پہلا افسانہ شائع ہوا، تو ایسا معلوم ہوا کہ افقِ ادب پر ایک نیا نویلا ستارہ طلوع ہو گیا۔ چمک دمک سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب یہ ننھا منا سا ستارہ آفتابِ ادب بن کر آنکھوں کو خیرہ کر دے گا۔ ادبی حلقوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ قرۃ العین کا مضمون دیکھ کر رسالہ پر چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی، واہ واہ کیا کہنا کرشن چندر جیسی ٹھوس رومانیت حجاب اسمٰعیل جیسی طلسمی فضائیں اور عصمت جیسے چٹختے ہوئے مکالمے...... جی نہیں خاص قرۃ العین کی اپنی تراش خراش رنگینی اور لوچ جو کسی خدشے کا محتاج نہیں۔

''اب خیر منایئے ادیبہ صاحبہ!'' احمد عباس نے ڈرایا اور میں نے خیر

منائی یہ چھوٹے تو اپنے ساتھ بڑے بن جانے کا ضمیر لے کر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ بعد میں آنے والے بہت سے جھمیلوں سے بچ جاتے ہیں۔ پہلے گزرنے والے بہت کچھ کیل کانٹے راستے میں سے ہٹا چکتے ہیں اور نئے آنیوالوں کو آگے بڑھنے میں بہت سی آسانیاں مل جاتی ہیں۔ لیکن ایک بات تو ہوگی۔ اب اکیلا اکیلا تلو بن نہ رہے گا۔ میدان بھرتا جا رہا ہے ایک کے بعد دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں مضمون بھی نکلا۔ ستارہ اسی جگہ جگمگاتا رہا۔

اس کا محور بدلا نہ چال ڈھال!!

دیکھنے والوں نے آنکھیں مل کر دیکھا اور بغور دیکھا کہ کہیں یہ ان کی آنکھیں بڑھاپے سے کمزور تو نہیں ہوتی جا رہی ہیں۔ ستارہ تو کچھ ٹمٹانے لگا ہے!!

''ٹھہرو جی ذرا سینڈریلا کی زمین پر اترنے کا انتظار کرو'' ناقد نے ڈھارس بندھائی مگر وہ خوابوں کی ''چارمنگ'' رانی اسی طرح دور خلاؤں میں ٹمٹماتی رہی۔

زمانے کی گھڑیال نے بارہ بجا دیئے اور جادو کی چھڑی کا طلسم تھک کر ٹوٹنے لگا۔

''اجی آپ کی قرۃ العین کیا لکھتی ہیں؟'' ''جی ہاں'' میری قرۃ العین۔ آخر ہمارا اتنا قریب کا رشتہ ہے نا۔ دونوں ایک ہی زنجیر کی اگلی پچھلی کڑیاں ہی تو ہیں۔ نئی کڑیاں تو پرانی کڑیوں سے زیادہ مضبوط ڈھلی ہوئی ہوتی ہیں، تو پھر بھول چوک کہاں ہوگئی خدایا۔'' (۲۳)

بقول عصمت چغتائی:

''.......... قرۃ العین کو سمجھنے کے لئے بڑی آسانی ہوگی، اگر نذر سجاد حیدر کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ جو ان کا نجی رشتہ ہے، وہی ان کا ادبی رشتہ بھی ہے۔ ادبی شجرے میں ''نذر سجاد حیدر'' ماں ہیں تو قرۃ العین بیٹی۔

دونوں کا واسطہ ایک ہی طبقے سے پڑا۔ لہٰذا دونوں کے مسائل بھی یکساں ہیں۔ وہ دُکھ جو اختر النسا نے جھیلے تھے قرۃ العین کی ڈولی پولی اور آنٹی جھیل رہی ہیں۔ دکھڑا وہی، یعنی ٹھیک ناپ تول، شوہر کی نایابی۔ اختر النسا کے والدین جابر ہونے کا الزام ماتھے پر لئے ہوئے تھے اور ڈولی پولی کے والدین مال تیار کر کے ڈرائنگ روموں میں بٹھا دیتے ہیں۔ گھیر گھیر کر کم از کم ۸ر سو کمانے والے شکار لاتے ہیں اور کھلی اجازت دیتے ہیں کہ مارو پھندا۔ پھندے چلتے ہیں۔ شکار پھاندا پھوندی کرتے ہیں پھنس گئے تو ٹھاٹھ کا ایک ایٹ ہوم ہوتا ہے۔ ورنہ ڈولی کا شکار روحی لے بھاگتی ہے۔ شوشو کو پوم پوم ہڑپ کر جاتی ہے۔ اور ٹوڈلز کو فی فی ڈکار جاتی ہے۔ یہ ہے لب لباب ان چارمنگ لوگوں کی رام کہانی کا۔ اختر النسا دق کا شکار ہو جایا کرتی تھی۔ پولی موتی ذہنی طور پر مدقوق ہو جاتی ہے۔ کتے انسانوں سے بہتر نظر آنے لگتے ہیں۔ ہر چیز کے پیچھے "کچھ نہونے" کا احساس ستانے لگتا ہے۔ "سب کچھ حاصل کرنے پر بھی موت پر اور کچھ نہ ہونے پر فتح حاصل نہیں ہو سکتی" زندگی اتنی عجیب بن جاتی ہے کہ اسے کوئی معنی نہیں پہنائے جا سکتے۔ اور وہ نہیں جانتیں کہ "وہ جنگل، وہ پہاڑ، وہ ندیاں، وہ جگہیں کہاں ہیں جہاں زندگی ہے"...... نذر سجاد حیدر نے کسی عنصر سے تو بغاوت کی، قرۃ العین حیدر میں وہ بھی سکت نہیں۔ جہاں تک ترقی پسندی کا سوال ہے، ان دونوں کا رشتہ بالکل الٹا نظر آتا ہے۔ یعنی ماں بیٹی سے آگے سوچتی ہے نذر سجاد حیدر جاگیرداری نظام کے زوال کے وقت اٹھی تھی اور قرۃ العین حیدر سرمایہ داری نظام کے زوال کی پیداوار ہیں۔ مگر انھوں نے کم از کم گرتی ہوئی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر سر نہیں پھوڑا تھا۔ جاگیرداری نظام کی خامیوں اور کوتہ اندیشیوں پر تاسف ہی کیا ہے۔ حالانکہ ان کے آنسو بے کار گئے کیونکہ وہ اس نظام کو دوبارہ کھڑا

تو نہ کر سکیں۔لیکن قرۃ العین حیدر سرمایہ داری نظام کے ڈوبتے ہوئے
سورج کے اندھیارے میں ہاتھ پیر مار رہی ہیں۔اس کی عفونت بھری
بوسیدگی سے انھیں گھن آتی ہے،مگر پیار بھی ہے۔وہ اپنے طبقے کو اس
مچھلی کے مانند سمجھتی ہیں جس کے اردگرد کا پانی سڑ چکا ہے مگر خشک
ریت پر بھی موت کے سوا کچھ بھی نہیں۔" (۴۴)

کرداروں پر تنقید کرتے ہوئے عصمت لکھتی ہیں:

"مگر قرۃ العین کے کردار اور ان کا رویہ سمجھ میں نہیں آتا۔یہ چار منگ
لوگ سب کے سب ایک ہی فرمہ کے ڈھلے ہوئے ہیں۔سب ہی تو
مرغابیوں کے شکار برگنڈی،کیوٹیکس،رابرٹ ٹائیلر سلونے حسن،
کارمن میرانڈا کے گالوں ایستھر ولیم کی سڈول پنڈلیوں کے دیوانے
معلوم ہوتے ہیں۔عیسائی یتیم خانوں کی تعلیم جہاں ذوق شعری
"ٹوئیکل ٹوئیکل لٹل اسٹار" سے شروع ہوکر چارج آف دی لائٹ
بریگیڈ پر ختم ہو جاتا ہے اور نثر کا مطالعہ باپ دادا کی بوسیدہ لائبریریوں
میں ٹھونسی ہوئی چند پراسرار جرمن،فرانسیسی،ترکی اور انگریزی کتابوں
تک محدود نظر آتا ہے،ویسے بھی صورت شکل میں چال ڈھال میں
سب یکساں ہی نظر آتے ہیں۔وہی خاموش جھیلوں جیسی نیلی آنکھیں،
سنہری گھونگھر والے بالوں کی مالک لڑکیاں اور سارے کے سارے
گیلنٹ ہینڈسم نوجوان۔نہ کبھی کسی کو چیچک نے کھرا کیا نہ ٹائیفائڈ
نے گنجا کیا۔نہ کبھی کسی کے خون میں کمی پیدا ہوئی۔سوائے عشق کے
کبھی کسی کو کوئی روگ نہیں ستاتا۔کبھی کوئی بے جوڑ وباؤں کا شکار نہ
ہوتا کیونکہ ان کے بارے میں کوئی لنگڑا لولا پھٹکنے ہی نہ پاتا۔ایک
بار کسی نے کہا تھا کہ قرۃ العین کے یہاں جنسی لگاؤ کا ذکر نہیں ہوتا۔
عریانی نہیں ہوتی۔ویسے تو،یہ بڑی اچھی بات ہے فحاشی کوئی فخر کی
بات نہیں۔لیکن اس فضا کو جوان کے افسانوں میں نظر آتی ہے کسی قسم

کی گھٹن سمجھا جائے؟ لڑکوں اور لڑکیوں کے جمگھٹے ہوتے ہیں مگر ایک عجیب قسم کی بے حسی طاری رہتی ہے۔ حسینائیں بالکل تھوک کے مال کی طرح پرکھتی ہیں اور پرکھی جاتی ہیں۔ جانو ٹھونک بجا کر تانبے کی پتیلیاں خریدی جا رہی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کی ایکسپورٹ امپورٹ ہو رہی ہے جیسے وہاں منڈی کی تلاش میں سمجھوتے ہوتے ہیں بالکل اسی طرح پراسپکٹس کی تلاش میں شادی بیاہ ہوتے ہیں احساس جنسی کبھی کا مر کے آٹے اور روٹی کی بوریوں والا احساس رہ گیا ہے۔ عشق میں جو بہت ہوا تو بے ہوش ہونے کو جی چاہتا ہے، اور ناکامی کے بعد تراڑ خیل روانگی ہو جاتی ہے.......... عام طور پر لکھنے والا ایک کردار چن لیتا ہے جو اس کے اپنے معیار پر پورا اتر سکے۔ جس میں وہ خود اپنی ہستی کو چھپا کر بٹھا دیتا ہے۔ وہ جو پڑھنے والے کو اپنے میں جذب کر کے جگ بیتی کو آپ بیتی کی چاشنی بخشتا ہے۔ یہ کردار کوئی خیالات کا ہیولا نہیں بلکہ حقیقت سے وابستہ صحیح اور غلط میں امتیاز کرانے والا کردار ہوتا ہے۔ مگر مس حیدر کا ہر کردار کوئی نہ کوئی ایسی چھچھوری حرکت کر بیٹھتا ہے کہ اس کی پوری تصویر میں ایک بے ہنگم سا کو بڑ نکل آتا ہے۔ ویسے آوے کا آوا ہی کچھ حد سے زیادہ چارمنگ لیکن اس کے سوچنے میں بھی باٹا کے جوتوں جیسی یکسانیت نظر آتی ہے۔ پڑھنے والے کو کچھ سوچنے اور سمجھنے میں مدد نہیں ملتی شاید اسی یکسانیت سے اکتا کر خود مصنفہ کبھی کبھی پڑھنے والے کو اچھال کر کسی ہال روم یا ہوٹل میں رقص کے دو چار چکر دے دیتی ہیں۔ کبھی جوہی کی کلیاں ناک میں ٹھونس دیتی ہیں۔ کبھی ستاروں اور آبشاروں میں گھسیٹ لے جاتی ہیں۔'' (۴۵)

عصمت چغتائی قرۃ العین حیدر کی طرز نگارش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''کردار نگاری کو چھوڑ کر اگر انداز تحریر کو دیکھا جائے تو اس میں انفرادیت

اور انوکھا پن کافی موجود ہے، ہاں کبھی کبھی انگریزی کے بعض الفاظ بھونڈے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے خیالات الٹے سیدھے ایک دوسرے سے کچھ اس طرح دست و گریباں نظر آتے ہیں کہ جی گھبرانے لگتا ہے۔ اب نکتہ ابھرتا ہے اس کی موافقت اور مخالفت کے سارے نکات دوڑ کر ساتھ لپٹ جاتے ہیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ''ہاں'' کہہ رہی ہیں یا ''نا''۔ حماقت اور عقلمندی کی باتیں ایک سانس میں ایک ہی ارادے سے ابلا کرتی ہیں۔'' (۲۶)

چنانچہ مضمون کے آخر میں عصمت چغتائی لکھتی ہیں:

''...... کاش ان کی پوم پوم ڈارلنگ ایک بار ان موئے ایرانی قالینوں کو دور پھینک کر ادھر مرے چارمنگ لوگوں کو بھول کر چل پڑے ...... مثلاً بمبئی ...... پھر یہاں اس کو ایک کامریڈ مل جائے جو اپنے آئیڈیلز کے لئے دنیا سے لڑ کر میدان میں آیا، پھر وہ اس سے شادی کرے تو جیمی زوفی کی محبت اسے مضحکہ خیز معلوم ہونے لگے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے لگے۔ گھر کا خرچ پورا کرنے کے لئے کسی اسکول یا اخبار کے دفتر میں نوکری کرلے اور شام کو دوستوں میں بیٹھ کر سوشلزم بگھارے اور ان کے لئے کافی تیار کرے۔ ''بخدا کافی بنانا'' ان چارمنگ بوروں'' سے مغز پچی کرنے سے ہزار درجہ زیادہ سہل اور دلچسپ مشغلہ ہے اور پھر جب اس کے بچہ کا باپ شاعر یا ادیب ہونے کے جرم میں نامعلوم میعاد کے لئے جیل میں ڈال دیا جائے تو ہر ہفتہ ننھے بچے کو گود میں لے کر اس سے ملنے جائے۔ خدا نے چاہا تو پرانے جراثیم مر جائیں گے۔ ٹوئی۔ ٹی ٹی اور جیمی کے پانچ غیر جانبدار کتوں کی جدائی شاق نہ گزرے گی۔ ایک ٹولڈر کو چھوڑ کر دوسرے کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔ اپنے پرانے خول سے نفرت بھی نہ رہے گی۔ صرف کبھی کبھی

پھریری آجائے گی۔

'' کچھ بھی نہیں '' مٹ کر'' بہت کچھ جنم لے گا۔ جمی ہوئی گرد جھڑ جائے گی اور مردہ زندگی میں چہل پہل جاگ اٹھے گی۔ ارے واہ کہیں بیسویں صدی میں بھی معجزے ہو سکتے ہیں!!!'' (۲۷)

پانچواں مضمون '' یہ بچے'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے ہندوستان کے بچوں کا حالِ زار اوران کی کس مپرسی پر روشنی ڈالی ہے۔ ہمارے ملک میں بچوں کی تعلیم وتربیت اور پرورش صحیح ڈھنگ سے نہیں ہو پاتی۔ اسلئے والدین اپنے بچوں کو وبال جان تصور کرتے ہیں —— بقول عصمت:

'' ...... میرا خیال تھا کہ دنیا میں بچے کے سب سے بڑے دشمن اس کے ماں باپ اور بھائی بند ہوتے ہیں۔ وہ اس کے دل کی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بیجا زبردستیوں سے اس کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کو کچل دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بڑے ہو جاتے ہیں تو بجائے مکمل انسان بننے کے چور، ڈاکو اور اچکّے بن جاتے ہیں۔ تبھی تو ہمارا دیش ترقی نہیں کر پاتا۔

لیکن خود ماں بننے کے بعد میرے خیالات نے ایک دم سے پلٹا کھایا اور یقین ہو گیا کہ آج کل کے بچے ہی کچھ ضرورت سے زیادہ مٹیلے، بے چین اور منہ زور پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کی تعمیر میں ہی کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے جو انھیں جنگلی بنا دیتی ہے۔ اگر سلیقے سے بچے پیدا کئے جائیں تو ہمارے دیش کے دلدّر دور ہو جائیں گے۔ اسی سلسلے میں مَیں نے سائکالوجی سے مدد لینی چاہی اور جی بھر کر تحلیل نفسی کر ڈالی مگر بیکار کیونکہ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ جس پگڈنڈی پر میں بھٹک کر چلی آئی ہوں۔ '' یہ کچھ بھی نہیں'' کی دنیا کے بیچوں بیچ ختم ہو جاتی ہے، میرے دونوں خیال غلط تھے، نہ ماؤں کا قصور ہے نہ بیچارے بچوں کا۔ قصور سارا ہے اس طریقۂ زندگی کا جو ایک مخصوص

نظام نے ہماری جانوں پر لاگو کر رکھا ہے جس نے ماں اور بچے کا رشتہ بھی توڑ مروڑ کر ایک کاروباری شے بنا دیا ہے اول بچے کے خیال ہی سے ایک ماں لرز اٹھتی ہے۔ جسمانی کوفت کے ڈر سے نہیں، اس ڈر سے کہ گھر میں اور کھانے والا منہ بڑھا۔ ایک جسم ڈھانکنے کی فکر بڑھی۔ اگر لڑکا ہے تو خیر خدا نہ کرے لڑکی ہے تو ایک اور تاوان بھگتنے کو تیار ہو جائے۔ اس کی شادی بیاہ کی فکر۔" (۲۸)

جیسا کہ عام طور سے ہمارے ملک کے باشندے اپنی پریشانی، بیماری، بے روزگاری اور غربت کو تقدیر کا کھیل یا دیوی دیوتاؤں کا چکر سمجھتے ہیں۔ اس کے ذمہ دار حکومت و ٹھہراتے ہوئے عصمت کہتی ہیں:

" کتنا ہی دل کو سمجھائیں، اب یقین نہیں آتا کہ ہماری مصیبتوں کے بڑھانے میں دیوی دیوتا یا تقدیر کا ہاتھ ہے جس نے اپنے بھیانک شکنجہ میں ہماری زندگی کی ضروریات کو دبوچ رکھا ہے۔ وہ منافع خوروں چور بازاریوں کا ہاتھ جو ہمارے سرکار کی لگام تھامے ہے اور جس کے اشاروں پر ہمارے اوپر فیل مست حملے کرتا ہے اور ہم یہ سب کچھ اس لئے سمجھ گئے ہیں کہ ہمارے سامنے روس کی شاندار مثال ہے۔ جہاں کا نظام مزدوروں اور کسانوں کا ہے جو انھوں نے برسوں کی محنتوں اور قربانیوں کے بعد خود اپنے لئے تعمیر کیا ہے۔ روس میں بچہ جنجال نہیں۔ ملک کا ایک طاقتور بازو ہے۔ ملک کی دولت ہے، جہاں پیدائش سے پہلے ہی ماں کی تخلیقی عظمتوں کو مرحبا کہہ کر آنے والے مہمان کی آؤ بھگت شروع ہو جاتی ہے ہمارے یہاں دوسرے سے تیسرے بچے کے آنے کی خبر سے ہی ماں باپ کے ہوش اُڑ جاتے ہیں پہلے تو محلہ ٹولے ہی کی فن کارروائیاں اس کو اتنی تیم دینے کی کوشش کرتی ہیں جس کی وجہ سے ملک میں ہزاروں عورتیں موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں، یا سدا کی روگی بن جاتی ہیں۔ مگر روس

میں زرخیز ہونے کو جرم یا گناہ نہیں سمجھا جاتا، بلکہ جیسے اچھے پھل پھول پیدا کرنے پر کاشتکار کی شہرت ہوتی ہے۔اسی طرح زیادہ بچوں والی ماں کو تمغہ یا انعام ملتے ہیں۔ وہاں یہ سارے بچے ماں کی چھاتی پر مونگ دلنے کو پلے نہیں رہتے نہ محلے ٹولے کا ناطقہ بند کرنے کو اچکوں کے گروہ مضبوط کرتے ہیں بلکہ ان کے لئے بھی گھر ہوتے ہیں۔ جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا پورا خیال رکھا جاتا ہے......... وہاں علیحدہ سنیما گھر تھیٹر اور لائبریریاں ہیں۔ جہاں انھیں کھیل ہی کھیل میں محنت کش اور مفید انسان بننے کی تعلیم دی جاتی ہے۔طبیعت کے رجحان کو دیکھ کر اس کا آئندہ فرض زندگی مقرر کیا جاتا ہے۔وہاں انھیں بتایا جاتا ہے کہ ایک محنت کش ایک فنکار۔وہ خواہ کسی ملک اور کسی رنگ اور نسل کا ہو ساری دنیا کی دولت ہے اور اس کی اپنی دولت ہے اور اپنے ملک کے لئے دولت خرید کر نہیں خود اپنے قوت و بازو سے پیدا کی جاتی ہے۔بچوں کو ملوں میں بھاری کام نہیں دیے جاتے کہ ان کی بڑھوار نہ ماری جائے۔

وہ مائیں جن کے بچے دن رات ان گھروں میں رہتے ہیں اپنے کام سے لوٹ کر وہاں جاتی ہیں اور وہاں اپنے ہی نہیں ہزاروں اور بچوں کو کلیجے سے لگا کر ماممتا ٹھنڈی کر سکتی ہیں۔''روس کے دشمن'' کہتے ہیں کہ اجتماعی زندگی نے گھریلو زندگی کو فنا کر دیا ہے'' ان احمقوں کو کون سمجھائے کہ روس میں ایک بانجھ کو بھی بچے گود لینے کی ضرورت نہیں، ملک کے سارے بچے ہی اس کے بچے ہیں سارا ملک ہی ایک خاندان ہے جہاں نہ بچوں کی کمی ہو سکتی ہے نہ ماں باپ کی۔'' (۲۹)

لیکن اس کے برعکس ہمارے ملک میں کثرت آبادی کو کنٹرول کرنے کی خاطر خاندانی منصوبہ بندی جیسے پروگرام کو فروغ دیا جارہا ہے۔بچوں کی شرح پیدائش کم ہو اس خاطر سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر خوب پرچار کیا جارہا ہے۔عصمت چغتائی اس کی مذمت

کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"............ہمارے ملک میں ہماری سرکار کی رائے ہے کہ شکّر کے دانے گن گن کر مائیں بچوں کو جنم دیں، نہ ضرورت سے زیادہ بچے پیدا ہوں گے نہ شکر کی کمی پڑے گی۔ کیونکہ اب یہ ڈر ہو گیا ہے کہ کمیونسٹ ماں کے پیٹ ہی میں بچے کے کان میں سرکار کے خلاف بھڑکانے والی باتیں پھونک دیتے ہیں جبھی تو آج کل کے بچے جنم سے شکر دودھ کے لئے منہ پھاڑے پیدا ہوتے ہیں۔
اسی لئے ہماری مہربان سرکار نے "اناج اگاؤ" کی اسکیم سے زیادہ زور شور سے "بچے نہ اگاؤ" کی اسکیم چالو کرنے کی ٹھان لی ہے۔
ایسے ملک میں اگر کوئی ڈھیٹ بچہ آن ہی ٹپکتا ہے تو وہ ایک مصیبت سمجھا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں بچے آنکھ کا نور دل کا سرور ہوتے ہیں۔ ہوتے ہوں گے۔ مگر ہماری آنکھیں تو الجھنوں کے اس نور کو ناکافی اور غلط خوراک کی وجہ سے بجھتے دیے کی طرح کانپتا دیکھتی ہیں۔" (۳۰)

عصمت چغتائی ایک جگہ روسی بچوں کے متعلق لکھتی ہیں:

"............ہمیں روس کے بچوں سے پیار ہے، وہاں کے خوش نصیب ماؤں سے پیار ہے، وہ خواہ کسی ملک رنگ و نسل کے بچے ہوں۔ دنیا کے بچے دنیا کی ماؤں کے بچے ہیں۔ وہ ہمارے بچے ہیں۔ ان پر یہ منڈلاتے ہوئے گِدھ چھاپہ نہ مار پائیں گے۔ ہم دنیا کے بچوں کے لئے انسانیت کے مستقبل کے لئے ہر مکروہ طاقت سے مقابلہ کریں گے۔ ہم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کھویا اپنے بچوں کی زندگی میں پانے کی کوشش کریں گے۔ ہم ان کے لئے ان کا مستقبل پُر امن اور روشن بنانے کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دیں گے۔" (۳۱)

مضمون کے آخر میں بیان کرتی ہیں:

"مبارک ہے وہ ملک جہاں بچہ بچے معنوں میں آنکھوں کا نور اور دل

کا سرور ہے۔ مبارک ہے وہ ملک جو انسانیت کا محافظ ہے۔ جہاں عورت ماں بن کر پچھتاتی نہیں بلکہ نسوانیت کو چار چاند لگاتی ہے اور فخر کے ساتھ اپنی کوکھ کی دولت کو پھلتا پھولتا دیکھتی ہے۔

آج روس کی بتیسویں سالگرہ کے موقع پر ہم عہد کرتے ہیں کہ روس کے عزائم کو مشعل راہ بنا کر ہم اپنے بچوں کا مستقبل بھی اتنا ہی روشن اتنا ہی شاندار بنائیں گے جیسا روسی بچوں کا ہے ہماری یہ جنگ ہمارے بچوں کی خاطر ہے ان کی حفاظت کے لئے ہم تمام فاشسٹ طاقتوں سے لڑیں گے۔'' (۳۲)

عصمت چغتائی کا ایک مضمون ''عورت ایک کھلونا'' کے عنوان سے ماہنامہ ''قومی راج'' بمبئی ۱۶ر نومبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں سماج میں عورت کی کیا حیثیت ہے۔ اس امر پر سیر حاصل بحث کی ہے اور خاص طور سے فلموں میں عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے انھوں نے اس مضمون میں خاص طور پر زور دے کر یہ بتایا ہے کہ عورت ہر حال میں بیچی اور خریدی جاتی ہے اس کا ہر جگہ بیوپار ہوتا ہے۔ ہر جگہ عورت کو ایک ہی حیثیت ہے اور وہ ہے کھلونا کی کہ جس کا جی جب چاہے اس سے کھیل لے۔ اس سلسلہ میں وہ یورپ کی عورتوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہتی ہیں:

''یورپ جہاں بظاہر عورت آزاد سمجھی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ عورت کا بیوپار کرتا ہے۔ عورت کو مرد کی دلچسپی کا سامان بنا رہنے کے لئے قسم قسم کی مصنوعات ایجاد کی ہیں.......... اشتہاروں سے اس کے دل میں یہ بات بٹھائی گئی ہے کہ اگر وہ مرد کے لئے جاذب نظر نہ بنی تو وہ زندہ لوگوں میں شمار نہیں کی جائے گی.......... غرض وہاں بھی ایک طرف تو چاند اور سورج فتح کئے جا رہے ہیں دوسری طرف عورت کو اسی طرح جھنجھنا بنایا جا رہا ہے۔ بیسیوں میگزین عورتوں کے لئے نکلتے ہیں، انھیں دیکھئے تو وہی سگھڑ بننے کے طریقے، حسن بڑھانے کے نسخے۔ اچھی بیوی اور اچھی ماں بننے پر شدت سے زور دیا جا رہا

ہے تا کہ وہ بلندیوں کی طرف نہ دیکھیں جہاں مرد حاکم بنے اپنی مرضی کی دنیا بناتے رہیں۔ جرمن قوم پر جب فاشزم چھایا تو سب سے پہلے عورت کے رہے سہے پر کتر لئے گئے۔ اسے باورچی خانے میں بند کر دیا گیا۔ مسولینی نے عورت کو سپاہی پیدا کرنے کی مشین بنا دیا۔ تا کہ وہ اس کے معاملے میں دخل نہ دے سکے۔ عورت اگر حکومت اور بزنس کے معاملوں میں دخل دے گی، اس میں زنانہ پن پیدا ہو جائے گا۔ جس بے رحمی اور کٹر پن کی ان معاملوں میں ضرورت ہے وہ نرم پڑ جائے گی۔ عورت شاید مجبور ملکوں کی عورتوں اور بچوں کا بھی خیال کرے۔ وہ اپنے بچوں کو دور دراز ملکوں میں کٹنے مرنے کے لئے راضی نہ ہو اس لئے اسے ہنڈیا چولھے میں گھسا دو اور اس خوبی سے کہ وہ اسے ہی اپنا مصرفِ زندگی سمجھے"۔ (۳۳)

عصمت آگے لکھتی ہیں:

"اشتراکی ملکوں میں عورت انسان سمجھی جاتی ہے۔ اس نے جسمانی بناؤ سنگھار کو اہمیت دینا نہیں سیکھا۔ وہ میدان جنگ میں مردوں کے دوش بدوش لڑ چکی ہے۔ وہ آرام سے گھر میں بیٹھی سولہ سنگھار نہیں کرتی رہی۔ ویت نام میں امریکی جوان خون بہاتا رہا اور امریکہ میں عورتیں بیٹھی بجتی رہیں۔ مگر روسی عورت نے ہر مورچہ پر اپنا خون بہایا ملک کی آزادی میں وہ برابر کی حصہ دار ہے وہ اپنے جسم سے نہیں دماغ سے سوچتی ہے۔ مرد کو بھی اس کی برابری کا اعتراف ہے کہ جب مرد محاذ پر لڑ رہے تھے تو وہ جرمن فاشسٹوں سے اپنے گھر کے مورچے پر مردانہ وار لڑی۔ اس کی نسوانیت کو چار چاند لگ گئے۔ آج وہ ہر مورچہ پر ڈٹی ہوئی ہے۔ اور وہاں کا مرد احساس کمتری کا شکار نہیں......
چین کی عورت کو مرد کے برابر حقوق حاصل ہیں صرف کاغذ پر نہیں زندگی کے ہر موڑ پر مرد اسے فخریہ ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اس کی زندگی

کا واحد مقصد مرد کو اپنا گرویدہ بنانا نہیں بلکہ اس کی زندگی کے بوجھ کو برابر بانٹنا ہے .... جس ملک میں عورت پچھڑی ہوئی ہے وہ ملک زندگی کی دوڑ میں پچھڑا ہوا ہے۔ عورتوں کی اکثریت جاہل اور مجبور ہے، بندھنوں میں جکڑی ہوئی ہے اس پر مذہب کی لگائی پابندیاں عاید ہیں۔ آج بھی جب کہ عورتوں کی تعلیم دن بدن ترقی کر رہی ہے، پڑھی لکھی عورت بھی اصولوں میں جکڑی ہوئی ہے۔" (۳۴)

فلموں میں عورت کے استعمال پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

"کچھ ایسی بھی فلمیں بنتی ہیں جن میں ہیروئن کا کردار اہم ہوتا ہے۔ وہ یا تو رنڈی ہوتی ہے جو زبردستی بنادی گئی ہوتی ہے اس لئے سولہ سنگھار کر کے درد بھرے گیت گاتی ہے اور سماج کو شاندار مکالموں کی صورت میں گالیاں دیتی ہے۔ کسی طلسمی ترکیب سے وہ کنواری بھی ہوتی ہے تا کہ اعلیٰ خاندان کا ہیرو اس سے شادی کر سکے۔ ایسی بھی ہیروئن پر فلم بنتی ہے جس کے حرام کا بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسی فلم ہوتی ہے جس میں ایک عدد "ریپ سین" نہیں ہوتا ...... فلمی ہیروئن کو دیکھ کر بے ساختہ خیال آتا ہے کہ عرب قوم بہت عقلمند تھی کہ پیدا ہوتے ہی لڑکی کو زندہ دفن کر دیتی تھی ...... عورت ہونا اتنی شرم کی بات نہیں۔ آج بھی کچھ باہمت لوگ ایسی فلمیں بنا رہے ہیں جن میں عورت صرف کھلونا نہیں، ایک جاندار فرد ہے تامل فلم "دکھتا پاروتی" میں وہ عورت نظر آتی ہے جو اپنے حالات سے سمجھوتا نہیں کرتی۔" (۳۵)

فلمی ہیروئن کی کس مپرسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"دیکھنا ہے کہ کب تک فلمی ہیروئن جی کا بہلاوا بنی رہے گی، یہ تو معلوم ہے کہ بہت سی فلم ہیروئنیں اپنی اس درگت سے خوش نہیں وہ بھی اچھے رول کرنا چاہتی ہیں مگر مجبور ہیں۔ جس طرح عام عورتیں زندگی میں مجبور ہیں یہ بھی کچھ نہیں کر سکتیں۔ اگر وہ نہ کریں تو ان کی جگہ لینے

والیوں کی کمی نہیں۔ یہ بھی ایک نظام کی غلام ہیں۔ ایک ہی راستہ ہے
کہ فلم لائن چھوڑ دیں مگر عورتوں کے لئے فی الحال کس لائن میں بھلائی
ہے؟ اور وہ ایکٹنگ کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہیں۔ جب تک عوام کا
مذاق نہ بدلے یہی سب چلتا رہے گا۔ عوام کا مذاق کون بدلے گا؟
خود عوام جب چاہیں گے بدل ڈالیں گے۔'' (۳۶)

عصمت کے خیال میں یہ سب اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک مرد چاہے گا۔ اگر مرد انصاف اور مساوات سے کام لے کر عورت کو اس کا جائز مقام دے دے تو پھر عورت کی حیثیت بھی مستحکم ہو سکتی ہے۔

عصمت چغتائی کا ایک مضمون ''منورما'' دلّی ۳۱ر جولائی ۱۹۸۵ء میں نئی تصویر عورت کی کے عنوان سے چھپا ہے۔ ہر چند کہ یہ مضمون دیوناگری رسم الخط میں ہے، لیکن اس کی زبان مکمل طور پر اُردو ہے۔

اس مضمون میں عورت کی نئی تصویر پیش کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ آج کی عورت کو صرف پلنگ کی زینت ہی نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ اس کے علاوہ وہ سماج کا ایک پرزہ بھی ہے۔ ادب میں عورت کا کیا مقام رہا ہے یا اس کا کیا مقام ہونا چاہئے۔ اس کی دلی کیفیات کی ترجمانی ایک عورت ہی اچھی طرح کر سکتی ہے۔ اس لئے عصمت نے اس مضمون میں اس بات پر کہ ایک عورت کی سماجی حیثیت کیا ہونا چاہئے روشنی ڈالی ہے۔

کلاسیکی ادب میں عورت کو محض معشوقہ یا محبوبہ کی صورت میں پیش کیا جاتا تھا، عورتوں کو مختلف قسم کی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا تھا اور اگر وہ اس امتحان میں پوری نہ اترتی تھی تو اس کا انجام دردناک ہوتا تھا۔ آگے چل کر کچھ لوگوں نے اپنی تخلیقات میں عورتوں کو چند قدم ترقی دے کر تعلیم یافتہ ہیروئن کے روپ میں پیش تو کیا تاہم ان کی حیثیت سماج کے لئے کلنک کا ٹیکہ ہی رہی انھیں اس طرح منظر عام لا گیا کہ ان کی تعلیم اور ان کی آزادی ہی ان کے لئے گمراہی کا سبب بن گئی۔ اس کا انجام بھی ناکامی کی صورت میں برآمد ہوا۔ مثلاً وہ ناجائز بچے کی ماں بن گئی وغیرہ وغیرہ۔ دراصل ایسی کہانیاں وہ لوگ لکھ رہے تھے جو عورتوں کو اپنے دوش بدوش کھڑا ہوتا برداشت نہیں کر سکتے تھے ان کے خیال میں عورت کو ہر حال

میں مردوں سے کمزور اور چھوٹا بن کر رہنا چاہئے۔ لیکن زمانہ جب کچھ اور آگے بڑھا تو کہانی کاروں کو بھی یہ احساس ہوا کہ اپنی کہانیوں میں عورتوں کے مسائل پر بھی توجہ دینی چاہئے۔ لہٰذا کچھ مصنفوں نے بھی عورتوں کے مسائل کو بھی پیش کرنا شروع کیا۔ مثلاً شادی اور طلاق کے مسائل بیوہ کی زندگی، عورت کی درگت وغیرہ ان لوگوں نے صرف مسائل ہی پیش کیے حل سے بحث نہ رکھی۔ مسلمان عورتوں کا تعلیم حاصل کرنا گناہ عظیم جانا جاتا تھا، نوکری کرنا تو بہت دور کی بات تھی، لیکن حالات نے کروٹ لی اور وہ وقت آگیا کہ لوگ خواتین کے تعلیمی امور سے دل چسپی کو مستحق نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اور لوگ خود بھی عورتوں کی تعلیم پر اپنا زور صرف کرنے لگے، اور کہانیوں میں خواتین کے ایسے کردار پیش کئے جانے لگے جن کا تعلق علم سے تھا بعض کہانیوں میں تو تعلیم یافتہ اور جاہل کے فرق کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ علم کی افادیت سامنے آجائے۔ ان میں زیادہ تر تعداد عورت کہانی کاروں کی رہی۔ عورتوں کے مسائل کو جتنا ترقی پسند ادیبوں نے پیش کیا اتنا کسی نے نہیں کیا، ان کی ہمدردیاں زیادہ تر جسم فروش اور فلمی دنیا سے وابستہ عورتوں کے ساتھ تھیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دیگر شعبہ سے متعلق خواتین پر ان قلم کاروں نے اپنا قلم بھی نہ اٹھایا۔ ان مصنفوں نے عورت ٹیچروں اور پروفیسروں کی بہت قدر و قیمت بڑھائی اور بڑی حد تک ان کے ان سارے مسائل کو اجاگر کیا جن سے وہ دوچار تھیں۔ اس کے برخلاف آج کے نئے ادیب بے تکی سی کہانیاں لکھ رہے ہیں جس کی صحیح سمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کہانیوں کے کردار سمجھ میں نہیں آتے کہ وہ کیا چاہتے ہیں سب کے سب الجھن اور گھٹن اور تنہائی کے شکار نظر آتے ہیں۔

ان کی کہانیوں میں عورت کا وجود اندر سے ٹوٹا ہوا سا نظر آتا ہے۔ بقول عصمت چغتائی:

> ''نیا لکھنے والوں کے یہاں عورت کا تصور بھی ان کی تحریروں کی طرح دھندلا ہے۔ صرف تنہائی ہے۔ عورت ایک عجوبہ سی نظر آتی ہے۔ وہ زندگی میں کم اور تصور میں زیادہ ہے۔ اس کی شخصیت شک اور شبہوں میں گم ہے خوبصورت اور نرالے جملوں میں الجھی ہوئی ہے۔ وہم میں قید ہے۔
>
> زندگی وہم نہیں، ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اب بھی بہت سی کہانیاں

لکھی جا رہی ہیں، جن میں عورت کا ایک صاف تصور ہے، وہ اپنے حق مانگ نہیں رہی ہے، خود لے رہی ہے۔ زندگی کی راہ میں کٹھنائیاں ہیں وہ ان سے جوجھ رہی ہے۔ ہار بھی رہی ہے۔ جیت بھی رہی ہے۔ اس کا مستقبل اب بھی باپ بھائی اور شوہر سے جڑا ہے۔ مگر وہ اپنے وجود کو پہچان رہی ہے۔ وہ صرف مرد کی ملکیت بننے کو تیار نہیں ہے۔ وہ بیٹی ہے، مگر باپ کو اپنی زندگی کا سودا کرنے کا حق دینے کو تیار نہیں ہے۔ بہن ہے، مگر صرف بھائی کی عزت کی خاطر اپنی زندگی کا خون کرتے فخر نہیں محسوس کرتی، وہ ماں ہے، مگر اولاد کی غلام رہ کر خوشی نہیں پاتی۔ اسے اب معلوم ہوتا جا رہا ہے کہ وہ ماں باپ کی چھاتی کا بوجھ نہیں ہے۔ وہ ایک عورت ہی نہیں ایک انسان بھی ہے۔'' (۳۷)

آجکل بیشتر ایسی کہانیاں شائع ہو رہی ہیں جن میں دکھایا جاتا ہے کہ عورت بغیر اپنی عزت نیلام کیے نوکری نہیں حاصل کر سکتی۔ دفتروں میں کام کرنے والی عورتیں آبرو کھو بیٹھتی ہیں۔ ان کے افسر بغیر ان کی عزت لئے کام نہیں دیتے۔ لیکن اس کے باوجود عصمت کے قول کے مطابق:

''اب ایسی عورت دھیمی چال سے افسانوں میں آ رہی ہے جو صرف پلنگ کی زینت نہیں سماج کا ایک اہم پرزہ ہے۔ اسے وجود کا یقین ہوتا جا رہا ہے، وہ اب صرف کسی کی بیٹی کسی کی بہن، کسی کی بیوی، کسی کی ماں ہی نہیں ایک جیتا جاگتا انسان ہے۔ اس کے دل سے احساس کمتری مٹتا جا رہا ہے۔ اسے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ اس کے ہاتھوں میں اتنا دم ہے کہ وہ حکومت سنبھال سکے، زندگی کو صحیح موڑ دے سکے۔ مردوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کام کرنے سے اس کی ذات کو ٹھیس نہیں لگتی، بلکہ چار چاند لگ جاتے ہیں'' (۳۸)

عصمت چغتائی کا ایک مضمون ان کے افسانوں کے مجموعے'' آدھی عورت آدھا خواب''میں شامل ہے۔ اس مضمون کا عنوان'' آدھی عورت آدھا خواب'' ہے۔ اس

مضمون میں انھوں نے سماج میں عورت کی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔

عام طور سے عورت کو مرد اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں۔اس مضمون میں انھوں نے مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ عورت مرد سے کسی بھی طرح سے کمتر نہیں ہے دنیا کے مفکرین کی آرا کو اگر یکجا کیا جائے تو عورت کی مختلف تصویریں سامنے آتی ہیں۔ بقول عصمت:

''بڑی اچھی، بے وفا، باوفا۔ایسی ویسی اور خدا معلوم کیسی کیسی۔ ہر ملک اور ہر زمانے میں بڑے بڑے مفکروں نے عورت کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے ضرور قائم کی ہے،کوئی صاحب اس کے حسن پر زور دے رہے ہیں تو کوئی اس کی پارسائی اور نیک سیرتی پر مصر ہیں، ایک صاحب کا خیال ہے کہ ''خدا کے بعد عورت کا مرتبہ ہے''۔تو دوسرے صاحب اسے شیطان کی خالہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔
ایک صاحب فرماتے ہیں''ایک دھوکے باز مرد سے ایک دھوکے باز عورت زیادہ خطرناک ہوتی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ ایک کالے مرد سے ایک کالی عورت زیادہ کالی ہوتی ہے''۔(۳۹)

ایک اور جگہ عصمت لکھتی ہیں:

''صدیوں سے عورت کے سر ایسے اوٹ پٹانگ الزام تھوپ کر مُفکرین اسے بوکھلانے کی کوشش کرتے آئے ہیں،یا تو وہ اسے آسمان پر چڑھا دیتے ہیں یا کیچڑ میں پٹخ دیتے ہیں۔مگر برابر کھڑا کرتے ہوئے ان کا دم نکلا جاتا ہے۔اسے دیوی اور آسمانی مخلوق بنادیں گے۔مگر دوست اور ساتھی کہتے شرماتے ہیں۔
سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ احساس کمتری ہے یا مغالطہ۔آخر انھیں عورت کی برابری سے کیوں ڈر لگتا ہے۔وہ بھی تو انسان ہوتی ہے۔اسے برابر بٹھاتے کیوں گھبراہٹ ہوتی ہے۔کیا مرد ایک گھڑی کے لئے یہ نہیں بھول سکتا کہ برابری کے لازمی معنی کمتری کے نہیں ہیں۔سب کو معلوم ہے کہ عورت۔ماں،بیٹی،بیوی اور بہن ہی بن سکتی ہے۔

باپ، بیٹا، میاں اور بھائی نہیں بن سکتی۔ پھر کیوں بار بار کہتے ہیں کہ وہ اسی لئے پیدا ہوئی ہے۔ کیا عورت کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ وہ عورت ہے جو مسلسل اسے بتایا جا رہا ہے؟

عورت بیوہ ہو جاتی ہے تو اس کی چوڑیاں توڑ دیتے ہیں۔ مرد کی گھڑی یا حقہ توڑنے کا کبھی کسی کو خیال نہ آیا۔ بیوہ لباس میں بھی تبدیلی کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ رنگا دوپٹہ پہنے یا ہاتھوں میں چوڑیاں ڈال لے تو لوگوں کے کلیجے پھٹ جائیں۔ مرد وہی سوٹ بوٹ، اچکن۔ انگرکھا ڈالے پھرتا ہے.......... حالانکہ عورتوں کو جیسے شوہر کا غم ہوتا ہے۔ بہت سی عورتوں اور مردوں کو نہیں ہوتا۔ مگر عورتوں کو ڈھونگ رچانا پڑتا ہے۔" (۴۰)

انھوں نے اس مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح سے آج دنیا سے جنس اور رنگ و نسل کی تفریق مٹ رہی ہے اسی طرح مرد اور عورت کے درمیان برتری اور کمتری کا جذبہ بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ عورتوں کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہو چلا ہے، انھیں بھی اپنا مقام و مرتبہ معلوم ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں نے مردوں کے دوش بدوش زندگی کے ہر میدان میں اپنے قدم بڑھانا شروع کر دیے ہیں۔ بقول عصمت:

"یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ مرد خواہ مخواہ الٹے سیدھے مقولے ٹھونکتے رہتے ہیں، اتنا بھی نہیں سوچتے، اب عورتیں بھی بقول ان کے نری عورتیں نہیں رہیں۔ بہت کچھ معلومات حاصل کرنے لگی ہیں۔ اب اس قسم کے گھسے پٹے جملوں سے جھانسے میں نہیں آئیں گی۔ سیدھی سادی تمیز کی بات کیجئے۔ عورتوں کو عورتوں سے زیادہ سمجھنے کا دعویٰ نہ کیجئے تو اچھا ہے۔ مفت میں پول کھلے گا۔ بڑائی چھوٹائی کے جھگڑوں میں پڑ کر وقت برباد کرنے کی آپ کو فرصت کہاں سے مل گئی جنس اور رنگ و نسل کا امتیاز بڑی تیزی سے مٹ رہا ہے۔ دنیا بڑی تیزی سے صنعت و حرفت کے میدان میں بڑھ رہی

ہے۔ دن بدن کام کرنے والوں کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ ہر شعبے میں عورتوں کو ہاتھ بٹانا پڑ رہا ہے۔'' (۴۱)

مضمون کے آخر میں عصمت لکھتی ہیں:

'' .... تمہارے گرد جو لوگ بیٹھے ہیں۔ سب انسان ہیں۔ نہ مرد ہیں نہ عورتیں۔ افسر ہیں یا کلرک، یہ میز ہے یہ کرسی اور چپراسی۔ تم نہ کمزور ہو نہ طاقتور، نہ صنفِ نازک نہ صنفِ کرخت۔ تمہارا وہی کام ہے جس کے لئے تنخواہ لیتے ہو۔ جب تک پیشہ نہ بدل لو تمہیں قدرت نے اسی مصرف کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہاں شوہر یا بیوی پھانسنے نہیں صرف کام کرنے آئے ہو۔ جسمانی یا دماغی طاقت یا کمزوری سے نہ فائدہ اٹھاؤ نہ کسی کا نقصان کرو۔ صرف شادی میں تمہاری منزل نہیں۔ کیونکہ شادی کر لینا منزل پر پہنچنا نہیں۔ اسے نبھانا اصل لمبی سڑک ہے۔

مگر گرو دیو تو کہتے ہیں:- اے عورت، تو آدھی عورت ہے آدھا خواب! کسی نے ان کی بیگم سے رائے لی ہوتی تو شاید یہ ہی کہتیں کہ گرو دیو خود پورے کے پورے خواب تھے اور خواب کی حسین ترین تعبیر بھی!

مگر ''عورتیں پیغمبر نہیں ہوتیں'' ——— ''عورتیں بنی نہیں ہوتیں'' ——— عورتیں مجذوب نہیں ہوتیں۔''

تو پھر کوئی اٹھ کر کہہ کیوں نہیں دیتا کہ ''عورتیں عورتیں نہیں ہوتیں!'' (۴۲)

اب تک عصمت کے مضامین کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے ہیں۔ جن مضامین کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ مختلف رسائل واخبارات اور افسانوی مجموعوں سے یکجا کئے گئے ہیں۔

عصمت کے بیشتر مضامین خواتین کی حمایت میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے نزدیک آج کے ترقی یافتہ دور میں جب کہ ہر چیز تغیر پذیر ہے تو عورت کو اس کی ترقی سے محروم کیوں رکھا جائے۔ کیا اس کا وجود دنیا میں صرف اسی لئے ہے کہ وہ زندگی بھر مردوں کی غلامی کرے؟ یا پھر ان کے بستر کی زینت بنی رہے۔ آج کا دور اس بات کا متقاضی ہے کہ مرد کے ساتھ

ساتھ عورت کو بھی تمام شعبہ ہائے حیات میں ترقی کے مواقع ملنے چاہئے اور اگر کوئی گروہ اپنے دقیانوسی خیالات کے سبب اس کی مخالفت کرتا ہے تو وہ کسی حال میں خواتین کا ہمدرد نہیں بلکہ دشمن ہے۔ آج کی عورت جس ترقی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سماج میں اپنی حیثیت مستحکم بنا لے گی۔

چونکہ عصمت کا تعلق ہر طبقہ کی خواتین سے تھا۔ اس لئے ان سب کے مسائل کا عصمت نے بخوبی مشاہدہ کیا تھا اور اس کے حل کے لئے انھوں نے تحریر کی شکل میں برابر آواز اٹھائی۔ عورت ہونے کے ناتے انھوں نے خواتین کے مسائل اور جذبات کو بڑے سلیقہ کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ جن مضامین کو لے کر یہاں بحث کی گئی ہے وہ ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی حقائق سے معمور ہیں۔ ان مضامین میں عورت کے سیاق و سباق میں عصمت نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہی خیالات ان کے افسانوی ادب کی ریڑھ کی ہڈی ہیں—

☆☆

باب ششم

عصمت چغتائی کے خطوط

غالب نے اردو مکتوب نگاری کو ایک اہم صنفِ ادب کی حیثیت عطا کی۔ یہ معنی کے لحاظ سے اپنے اندر بڑی وسعت رکھتی ہے۔ خط کے ذریعۂ نہ صرف ایک دوسرے کی خیر و عافیت ہی معلوم ہوتی ہے بلکہ خط میں لکھنے والے کی اندرونی کیفیات، مشاہدات اور واقعات کی ترتیب کا شعور بھی ملتا ہے۔ کبھی کبھی عام حالات میں لکھے ہوئے خط دستاویز کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ خط کیا ہے؟ دراصل یہ دو آدمیوں کے درمیان ہونے والی تحریری گفتگو کا نام ہے۔ جس سے اور کسی کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ خط میں انسان کو اس کے اصل روپ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ خطوط شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس لئے خطوط کے ذریعہ مکتوب نگار کی شخصیت کو سمجھنے اور پرکھنے میں سہولت بھی ہوتی ہے۔ ''مکاتیب احسن'' کے مرتبین ڈاکٹر عنوان چشتی اور صغیر احسنی جلال آبادی اس سلسلہ میں کہتے ہیں کہ ''مکتوب (اگر وہ شائع کرانے کے خیال سے نہ لکھا گیا ہو) مکتوب نگار کی شخصیت کا بیساختہ اور براہِ راست آئینہ ہوتا ہے۔ اس لئے خط کی خارجی اور داخلی خصوصیات کے مطالعہ سے مکتوب نگار کی شخصیت کو سمجھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔''(۱) کیونکہ مکتوب نگار خط لکھتے وقت آزاد ہوتا ہے۔ وہ جس طرح چاہے اپنے دلی جذبات کا اظہار کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خط کا اندازِ تحریر اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بقول مولانا عبدالحق ''خط دلی خیالات اور جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔ اس میں وہ صداقت اور خلوص ہے جو دوسرے کام میں نظر نہیں آتا۔''(۲) ڈاکٹر جانسن کے الفاظ میں ''خطوط میں انسان کی روح عریاں نظر آتی ہے۔''(۳) خطوط میں سوانحی اشاروں کے علاوہ مکتوب نگار کے کردار اور افتادِ مزاج کی تصویر بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ خطوط کے ذریعے مکتوب نگار کی حیات اور شخصیت کی تصویر کے ساتھ ساتھ اس کی تصانیف اور تخلیقی محرکات کا پتہ بھی چلایا جاسکتا ہے۔ خطوط سے اس عہد کی تاریخ بھی مرتب ہوسکتی ہے سیاسی گتھیوں کے خم کو بھی سلجھایا جاسکتا ہے۔ خطوط ہی وہ آلہ ہے جس کے ذریعہ ادیبوں اور سیاست دانوں کے صحیح خط و خال کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ اسی پس منظر میں ہم عصمت چغتائی کی مکتوب نگاری کا تنقیدی جائزہ لے رہے ہیں۔ انھوں نے کئی ایسے خطوط لکھے ہیں جو مختلف رسالوں

میں اپنی جگہ محفوظ کئے ہوئے ہیں۔

''نقوش افسانہ نمبر'' ستمبر،اکتوبر ۱۹۵۲ء کے شمارے میں آٹھ خط چھپے ہیں پہلا خط اخلاق صاحب کے نام ۲۶ راگست ۱۹۴۱ء کولکھا گیا ہے یہ خط اخلاق صاحب کے اس خط کا جواب ہے جو انھوں نے عظیم بیگ چغتائی کے انتقال پر عصمت کولکھا تھا۔

دوسرا خط بھی انھوں نے اخلاق صاحب کولکھا ہے جس کی تاریخ ۴۱۔۱۔۳ء ہے اس خط میں شاہد لطیف کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں اس سلسلہ میں انھوں نے عصمت سے مدد مانگی ہے اور عصمت نے وعدہ کیا ہے کہ علی گڑھ رہوں گی تو بھر پور مدد کروں گی۔

تیسرا خط بھی اخلاق صاحب کو ہی لکھا گیا ہے۔ یہ خط بھی جودھ پور سے لکھا گیا ہے۔اس خط میں انھوں نے اپنے جودھ پور سے بمبئ جانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ خط اکتوبر ۱۹۴۱ء کا تحریر کردہ ہے۔

چوتھا خط بھی انھوں نے اخلاق صاحب کو ہی تحریر کیا ہے۔اس میں انھوں نے بمبئ کی طرز رہائش پر روشنی ڈالی ہے۔اس وقت وہ شاہد لطیف کے ساتھ وہاں رہ رہی تھیں۔ اس خط میں ان کے مشہور ناولٹ ''ضدی'' کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ جسے انھوں نے اپنی اولاد سے تعبیر کیا ہے۔

پانچواں خط مورخہ ۴ راکتوبر ۱۹۴۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ خط بھی اخلاق صاحب کے نام سے ہے۔اس میں انھوں نے اخلاق صاحب سے کسی مضمون کی فرمائش بھی کی ہے، جسے وہ اپنے رسالے'' تاجور'' میں شائع کرنا چاہتی تھیں۔

چھٹا خط بھی اخلاق صاحب ہی کے نام ہے۔ یہ خط بمبئ سے لکھا گیا ہے۔ جس پر ۲۲ راکتوبر ۱۹۴۳ء کی تاریخ درج ہے۔اس خط میں انھوں نے ان کے بھیجے ہوئے مضمون کی تعریف کی ہے۔ لکھتی ہیں:

> ''پیارے دیور صاحب مضمون ملا۔عنوان اس قدر گہرا ہے کہ اگر ناولیں لکھی جائیں تو بھی تہہ نہ ملے۔ یوں کیجئے کہ اس مضمون کو برباد نہ کیجئے۔ بہت ہی لطیف چیز لکھی جاسکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ لکھتے لکھتے شرما گئے۔اور'' بتانے والی بات'' ٹال گئے۔آپ اسٹیشن

گئے وہاں ''سر بند پارسل'' ملی۔ پھر؟ پھر کیا ہوا۔ یقین مانئے آپ کی عزت پر حرف نہ آئے گا۔ آپ بتا دیجئے کہ پھر کیا ہوا۔ یوں بات موڑ توڑ کر گول کر گئے آپ نے مضمون بہت اچھالیا ہے۔ یعنی دواؤں کے اشتہارات کی وجہ ـــ یہی ''سر بند پارسل'' ان دونوں نکات کو ایک لڑی میں پرو دیجئے۔ دیکھئے اگر میں اس مضمون کو لکھتی تو ''سر بند پارسل'' سے ملنے تک تو یہی مضمون رکھتی اور اس کے بعد تھوڑی سی مضمون نگار کی ناتجربہ کارانہ گھبراہٹ ''پارسل'' کی طنزیہ مسکراہٹیں وغیرہ۔'' (۴)

ساتواں خط بھی انھوں نے اخلاق صاحب کے نام لکھا ہے۔ اس میں مضمون کی فرمائش ہے اور اپنے رسالے کی اشاعت کے سلسلے میں ان سے تعاون کی درخواست کی ہے۔

آٹھواں خط بھی اخلاق صاحب کے نام ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے۔ کہ شاہد صاحب کے لئے جو مضمون آپ نے طلب کیا ہے۔ وہ موقع ملتے ہی لکھ کر بھیج دوں گی۔ عصمت کی تحریر میں:

''ہاں وہ دہلی کے پروگرام کے لئے مضمون کا حکم تو ملا تھا۔ مگر آج کل موڈ نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں لکھنے کا دورہ نہیں پڑا ہوا ہے۔ کوشش کی کبھی آج تک کوشش نہیں کی۔ پھر بھی ''باجی'' سے کہئے گا۔ جونہی قلم چلے گا پہلے ان کی فرمائش پوری ہوگی .... کیا بتاؤں آج کل تو خط لکھنا تک دشوار ہے۔ آج کل زبان تیزی سے چل رہی ہے۔ لہٰذا قلم سہا ہوا ہے۔'' (۵)

گویا یہ سارے خطوط جو اخلاق صاحب کو لکھے گئے ہیں، عصمت کے تشکیلی دور کے ہیں یعنی اس وقت کے جب ابھی انھوں نے ادبی دنیا میں قدم رکھا ہی تھا۔

''نقوش خاص نمبر'' دسمبر ۱۹۵۹ء میں بھی عصمت کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ یہ خط انھوں نے طفیل صاحب کو لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے ادب کے بارے میں اپنے کچھ خیالات تحریر کئے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''مجھے کیا معلوم کہ افسانہ ترقی کر رہا ہے کہ تنزل پذیر ہے۔ مجھے فن تھوڑا بہت آتا بھی ہو تو فن کو پرکھنا میرا کام نہیں۔ یہ تنقید نگاروں کا کام

ہے۔"(۶) اسی خط میں عصمت چغتائی آگے یہ لکھتی ہیں:

"میں سخت ناقدانہ نظر سے افسانے نہیں پڑھتی، لطف اٹھانے کے لئے پڑھتی ہوں اور سارے افسانوں پر نظر ڈال کر اس وقت یہ فیصلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ ویسے میں ایک بات کہوں آپ سے مجھے تنقیدوں سے کبھی دلچسپی نہیں۔ کسی نے برائی کی تو میرا دل نہ ٹوٹا، کسی نے تعریف کی تو میرا دماغ نہ خراب ہوا۔"(۷)

آجکل کے نقادوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں:

"......... ویسے تنقید نگار کسی افسانہ نگار یا اس کے افسانے کو لے کر تنقید نہیں کرتے اس کی اچھائی اور کمزوری پر ایسی رائے نہیں دیتے جو لکھنے والے کو کسی قسم کی مدد دے سکے — چلتے چلتے وہی پرانے جملے دہراتے ہیں۔ فلاں فحاش ہے، فلاں کے یہاں گیرائی، فلاں کے ہاں رجعت پسندی پائی جاتی ہے اور فلاں نعرے بازوں کی فہرست میں آتا ہے۔ کیوں؟ اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا کہ یہ راستہ منزل کی طرف جاتا ہے اور اس راستے میں یہ خطرے ہیں۔"(۸)

عصمت اس خط میں تبصرہ کرتے ہوئے نقادوں سے ایک مرتبہ پھر کہتی ہیں:

"افسانوں سے زیادہ آجکل تنقیدیں لکھی جارہی ہیں۔ کاش! یہ لوگ بجائے ادب میں جمود کا رونا رونے کے خود کوئی جمود شکن افسانہ لکھ ماریں کہ چھٹی ہو۔ یہ لمبے لمبے مقالے لکھ کر بور کرے جاتے ہیں اور رسالے والے چھاپتے جاتے ہیں۔"(۹)

اس خط میں انھوں نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ادب کی تخلیق سے زندگی کی ضرورتیں پوری نہیں کی جاسکتیں اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ مقالوں والے رسالے ہمیشہ تنگدستی کا شکار رہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں کہانیاں چھاپنے والے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔

ایک خط "افکار" کراچی کے "جوش نمبر" اکتوبر، نومبر ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ خط بہت مختصر ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ —

''جوش صاحب زندگی میں بھی ویسے ہی چاق و چوبند اور گرجدار نظر
آتے ہیں، جیسے اپنی شاعری میں۔'' (۱۰)

عصمت چغتائی کا ایک خط ''نقوش'' لاہور نومبر ۱۹۶۴ء میں منظر عام پر آیا ہے۔
اس میں انھوں نے ہندوستان میں اردو زبان کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''مگر آپ کو ایک بڑا شدید مغالطہ ہے کہ اردو کی پناہ گاہ صرف پاکستان
ہے یقین مانئے کہ یہاں اردو کی شدید مانگ موجود ہے، اردو کے
علاوہ ہندی، گجراتی، مراٹھی، سندھی اور بنگالی میں بھی موقع اور گنجائش
ہے اور لکھنے والے کو اس سے زیادہ کیا چاہئے کہ اس کے خیالات کسی
بھی ذریعہ سے دوسروں تک پہنچ جائیں۔ اردو سرکاری زبان نہ ہوتے
ہوئے بھی ہر صوبے میں زیادہ سے زیادہ سمجھی جارہی ہے، زیادہ تر فلم
جو ملک کی واحد تفریح کا ذریعہ ہے اردو ہی میں بنتے ہیں۔' (۱۱)

نقوش خطوط نمبر اپریل، مئی ۱۹۶۸ء میں ان کے چھ۶ خطوط شائع ہوئے ہیں جو
انھوں نے واجدہ تبسم کو لکھے ہیں—

پہلا خط ۲۵ رفروری ۱۹۵۸ء کو لکھا گیا ہے اس میں انھوں نے اپنی فلمی زندگی
اور ناول نگاری کی طرف لطیف اشارے کئے ہیں۔

دوسرا خط کے مطالعہ سے ان کی نجی زندگی کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ
ہوتا ہے۔ بقول عصمت:

''سڑن تم مجھے امیر کیوں سمجھتی ہو۔ مجھے تو پیسے کی بڑی قلت رہتی ہے۔
بہت سا قرضہ ہے۔ ڈھائی سو مکان کا کرایہ کئی کئی ماہ کا چڑھ جاتا ہے۔
میں اور شاہد دونوں مل کر کماتے ہیں پھر بھی کڑکی آتی رہتی ہے۔ میرے
بنک میں اس وقت ایک سو چھبیس روپے ہیں۔ گھر کا خرچہ دو ہزار
مہینہ ہے۔ دنیا کے کوئی عیش نہیں کرتی صرف ڈیڑھ روپیہ کے ٹکٹ
سے سنیما دیکھتی ہوں اور ایک نیا پیسہ پوائنٹ سے رمی کھیلتی ہوں۔ کتابیں
خریدنا بہت کم کردی ہیں ورنہ کسی زمانے میں میں اور شاہد دو ڈھائی

سوروپے مہینہ کی کتابیں ضرور خریدتے تھے۔ کتابیں بہت ہیں لیکن بہت سا کوڑا بھی ہے۔ دو فلم تیار ہیں لیکن سب قرضداروں کی مٹھی میں ہیں۔ سونے کی چڑیا تیار ہے صرف بیک گراؤنڈ میوزک رہ گیا ہے۔ پکچر خاصی ہے چلے تب جانیں۔ سو فی صدی ناچ گانے سے بھرپور پکچر نہیں ہے۔" (۱۲)

اس خط میں انھوں نے اپنی دونوں بچیوں کی تعلیم اور ان کی دلچسپیوں کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتی ہیں:

"میری بڑی بیٹی سیما تیرہ سال کی ہے وہ پونا سے ذرا آگے پنچگنی ہل اسٹیشن ہے وہاں بورڈنگ میں ہے۔ میرے گھر میں ذرا فلموں کا زور رہتا ہے اس لئے اسے اس فضا سے دور بھیج دیا۔ چھٹیوں میں آتی ہے تو نرگس دلیپ کمار پر مرتی ہوئی آتی ہے۔ میں اسے دو تین دن کے لئے دلیپ کمار کے ہاں رہنے کو بھیج دیتی ہوں وہ اسے بہت ستاتا ہے بس پھر سارا گلیمر ختم ہو جاتا ہے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے یہ عمر ہی ہیرو ورشپ کی ہوتی ہے۔ آج کل وہ الوس پر سنے اور پیٹ بون اور راک ہڈسن پر فدا ہے۔ میرے خیال میں جنوں کی حد کو نہ پہنچے تو یہ ہیرو ورشپ بری چیز نہیں۔

میری چھوٹی بیٹی چھ سال کی ہے اور وہ بمبئی میں ہی پڑھتی ہے۔ وہ نوتن اور شیاما کے بعد سیما کی پوجا کرتی ہے۔" (۱۳)

تیسرا خط ستمبر ۱۹۵۸ء کو بمبئی سے تحریر کیا ہے جو واجدہ تبسم کے ہی نام ہے۔ اس میں انھوں نے کچھ اپنی نجی زندگی کے متعلق اور کچھ واجدہ تبسم کی نجی زندگی کے بارے میں لکھا ہے۔ مصروفیات کے متعلق عصمت لکھتی ہیں:

"آج کل عجیب پروگرام ہے میں ایک ماسٹر سے ویدانت پڑھ رہی ہوں۔ ابھی تین دن سے ایک ہی سبق پڑھ رہی ہوں یعنی دنیا کا آغاز کیسے ہوا؟ ارادہ ہندو مائی تھولوجی پڑھنے کا تھا مگر ساتھ ساتھ فلسفہ بھی

چپکا ہوا ہے۔ وہ بھی پڑھنا ہوگا۔ منتروں کا لب لباب پڑھا اور سمجھا ہے۔ ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کے عقائد پر بھی بحث ہوتی جا رہی ہے۔ بڑا لطف ہے۔ ہندو مائی تھولوجی میں دنیا بڑے مزے سے بنتی ہے۔ کچھ اپنی ''کُن'' سے ہی ملتا جلتا عقیدہ ہے۔'' (۱۴)

چوتھے خط کے مطالعہ سے شاہد لطیف اور عصمت چغتائی کی ازدواجی زندگی پر روشنی پڑتی ہے:

''.......... ہم دونوں کی شادی بے حد کامیاب ہے۔ کیونکہ سوائے بچوں کے کوئی مروت ہمارے درمیان نہیں بہت کم ایک دوسرے سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ میں ذرا لوگوں میں گھسنے کی عادی ہوں مگر شاہد بڑے کم سخن ہیں ہم دونوں میں کروڑوں میل کا فاصلہ ہوتے ہوئے بھی کچھ زیادہ دوری نہیں۔ بڑا لطیف رشتہ ہے ہمارا۔ مجھے تو نہ دنیا کا ڈر ہے نہ دین کا پھر بھی ساتھ رہتے ہیں کچھ کوفت نہیں ہوتی Tolerance میری جان ایک ایسی ضروری چیز ہے جس کی مدد سے آپ سب کچھ کر سکتے ہیں اور پھر مجھ میں کون سے لال جڑے ہیں میں بھی ماشاء اللہ کافی نکمّی ہوں شاہد شراب خانہ میں دھر لئے گئے۔ میں نے صرف جملہ بازی کی۔ بخدا غصہ نہیں آیا۔ لوگ متعجب ہیں کہ میں جو چڑی کی دُگی پر مر بیٹھی ہوں جو راہ چلتوں سے الجھتی ہوں۔ شاہد کی زندگی کیوں نہیں حرام کر دیتی۔'' (۱۵)

پانچواں خط بھی ان کی نجی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خط میں بھی انھوں نے اپنی دونوں بچیوں کا ذکر کیا ہے۔ بڑی لڑکی تو پڑھتی ہی تھی چھوٹی بچی کا بھی پچگنی کے اسکول میں داخلہ کرا دیا اسے وہاں چھوڑنے خود گئی تھیں، انھیں پچگنی ہل اسٹیشن بہت پسند آیا اس کی تعریف کرتے ہوئے بیان کرتی ہیں:

''.......... بہت پُر فضا مقام ہے بالکل حجاب اسمٰعیل کے افسانوں جیسا لمبے شاہ بلوط کے درخت اور پچ مچ نارنگی کی کلیاں! میرا کمرہ

الگ تھلگ کونے میں تھا۔ دل بہلانے کو بجائے پڑھنے کے لکھتی
رہی۔ پہاڑ پر چڑھنا لمبی لمبی سیریں، بہت اچھا وقت گزرا کل واپس
آ کر تمہارا اور بانو کا خط تکیئے کے نیچے ملا۔ میرا تکیہ میرا دفتر بے معنی
ہے۔ بڑی دلچسپ چیزیں رہتی ہیں نیچے۔'' (۱۶)

چھٹے خط میں جو بات قابل ذکر پائی جاتی ہے۔ وہ خواجہ احمد عباس کی بیوی کے انتقال کا ذکر ہے۔ عصمت کے الفاظ میں:

'' آج میرا دل بہت بری طرح بیٹھا جا رہا ہے۔ آج میری ایک بڑی پیاری دوست کا سوئم ہے۔ پرسوں احمد عباس کی بیوی مجتبائی کا نمونیہ میں انتقال ہو گیا۔ دل کا آپریشن ہوا تھا وہ تو کامیاب رہا۔ پانچ سال کی بیماری میں اتنی نازک ہو گئی کہ آسانی سے ڈبل نمونیہ نے دبوچ لیا۔

آج مجھے وہ سولہ برس پہلے کی مجی (اسے پیار میں مجی کہتے تھے) یاد
آ رہی ہے۔ پندرہ بیس دن کی بیاہی ڈلہن مجی سے ملنے ملانے رات
کے وقت پہنچی تھی۔ کتنی گڑیا سی لگ رہی تھی ہاتھوں کی مہدی بھی پیلی
نہ ہوئی تھی۔ موتیوں کی لڑی جیسے دانت چمکا چمکا کر مجھ سے الجھا کرتی
تھی۔ پندرہ دن ہوئے اسے ہسپتال میں دیکھنے گئی تھی۔ بالکل ٹھیک
تھی مجھ سے ویسے ہی الجھنے لگی جیسی کہ اس کی عادت تھی۔ میں نے کہا
ٹھہر جا تیری باتوں کا تھوڑا دم آ جائے تجھ میں جب جواب دوں گی
اور میرے جواب میرے دل ہی میں گھٹ گئے۔ آج دل بڑا اداس
ہے۔ وہ جینا چاہتی تھی۔ بڑی ضد سے جینا چاہتی تھی۔

اُمید ہے کہ تم اب پُر سکون ماحول سے گزر رہی ہوگی یہ دل اتنی گہری
چوٹ کیوں لیتا ہے۔ اسے پتھر بنانا چاہئے۔ مگر پتھر بھی تو چیخ جاتے
ہیں۔'' (۱۷)

''عبداللہ ہال ریویو'' ۱۹۸۰ء میں دو خط عصمت کے شائع ہوئے ہیں۔ دونوں ہی خط محسن صاحب کے نام ہیں۔ پہلے خط میں دو تین باتیں بہت اہم ہیں۔ پہلی شیام بنیگل

کی فلم میں ایکٹنگ اوراس کی مصروفیات کی دوسری سفرروس سے متعلق اور تیسری مشہور زمانہ ''لحاف'' کی اشاعت اوراس کے طفیل میں ملنے والی گالی کا ذکر۔

دوسرا خط جو محسن صاحب کے ہی نام ہے اس میں انھوں نے محسن صاحب سے اپنے تعلقات اور محسن صاحب کی بیوی شاہدہ (جو عصمت کی ہم جماعت تھی) ان کا بھی ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے۔ ساتھ ہی کالج کے زمانے کی کچھ پرانی یادوں کو بھی کرید کر تازہ کیا ہے۔ اور ساتھ ہی اپنے پاکستان جانے اور وہاں علی گڑھ گرلز کالج کی اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے ملاقات کے احوال بھی قلم بند کئے ہیں۔ محسن اور شاہدہ کے باہمی تعلقات اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج پر بھی ایک ناقدانہ نظر ڈالی ہے محسن صاحب سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار بھی بڑے دلکش انداز میں کیا ہے۔

اس کے علاوہ اس خط میں کچھ خاص باتیں بھی سامنے آتی ہیں جو ان کی نجی زندگی سے متعلق ہیں۔ کچھ اہم نجی معلومات جو عصمت کے دل کی کیفیت تھی اس کا اظہار ہونے لگا۔ مثلاً شاہد لطیف کے انتقال کے بعد عصمت جن پریشانیوں سے دوچار ہوئیں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''مجھے شاہد کی مدد کے بغیر اپنی دو بچیوں کو سنبھالنا تھا۔ سیما نے شادی کرلی۔ شاہد چل دیے۔ ان کے پاس موت کے وقت سات روپے تھے۔ میں نے کیسے ان کے کفن دفن کا خرچہ نکالا میں ہی جانتی ہوں۔ شاہد نے فلموں کے سارے کاغذات اپنے کسی دوست کو دے رکھے تھے۔ وہ کون تھا مجھے پتہ نہ تھا۔ پانچ فلموں سے مجھے کوڑی نہ ملی۔ میں کچھ نہ کرسکی مگر میں نے گھر میں پے انگ گیسٹ رکھ کر دو وقت کی روٹی کا انتظام کیا۔ چند سال میں نے کیسے گزارے میں ہی جانتی ہوں، مگر نہ میری آنکھ سے آنسو نکلا نہ میں نے کسی سے شکایت کی اور نہ مدد مانگی۔ میں صرف چند سفید ساڑیوں کو لانڈری سے دھلوا دھلوا کر عام جلسوں میں شرکت کی اور میرے کھلے ہوئے چہرے کے پیچھے جو کرب چھپا تھا اسے میں نے کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔'' (۱۸)

عصمت چغتائی کا ایک خط ماہنامہ بیسویں صدی دہلی مئی ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ خط 'بیسویں صدی'' کے ایڈیٹر نیر صاحب کے نام ہے۔

اس خط میں عصمت نے انھیں حج کی مبارک باد دی ہے۔ اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنے جذباتی لگاؤ کا ذکر کیا ہے ساتھ ہی تقسیم ہند کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ علم کے میدان میں ان کی دلچسپی نہ لینے کی جانب بھی اشارہ کیا ہے اور اس کے اسباب وعلل پر بھی رائے زنی کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمان انگریزوں کے زمانے میں بھی ہندوؤں کے مقابلے میں بھی پیچھے تھے اور آج بھی ہیں۔ کچھ ہندوستان کے سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے اس خط کے ایک اقتباس سے اُردو کے جدید ادب کے آغاز اور اس کے موضوع پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ عصمت کی تحریر میں ملاحظہ فرمائیں:

> ''تم اگر جدید ادب کو پڑھنے کی ہمت رکھتے ہو میرا مطلب اُردو جدید ادب اس کا فیشن پاکستان سے چلا ہے اور پہلے وہاں سے جدید ادب ابھرا انجانا خوف، بے سبب کی مجبوریاں، گھٹن کٹی ہوئی زبانیں، اندھی آنکھیں۔ الا بلا ہے۔ یہاں بھی فوراً جدید ادیبوں نے وہ انداز تحریر لپک لیا۔ بہت حد تک ٹھیک ہوگا۔ ان پر ضرور ذہنی کرب طاری ہوگا۔ ویسے ہی انسان مہنگائی اور مار دھاڑ سے پریشان ہے۔'' (۱۹)

عصمت چغتائی کا ایک خط آجکل نئی دہلی نومبر ۱۹۸۵ء سلسلہ سوالوں کا'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ انھوں نے ایڈیٹر'' آجکل'' راج نرائن راز کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں '' آجکل'' کو اپنا مضمون کیوں بھیجوں۔ انھیں اعتراض ہے کہ فلمی رسالوں کے مقابلہ'' آجکل'' کم خریدا اور کم پڑھا جاتا ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ اس کا معاوضہ بھی بہت کم ملتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میرے بچے اردو نہیں جانتے۔ اس خط سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو اکادمیوں سے بھی شکایت ہے۔ خط کے آخری اقتباس میں انھوں نے اپنے پاکستان کے سفر کے متعلق بھی لکھا ہے جب وہ جشن فیض کے موقع پر وہاں گئی تھیں۔۔۔وہ لکھتی ہیں:

''.........پندرہ دن کے لئے پاکستان فیض احمد فیض کے جشن کے سلسلہ میں گئی تھی چار مہینے کے لئے روک لیا اور میری جو بھی کہانی وہاں چھپی تھی اس کا معاوضہ میرے حوالے کر دیا۔ جو میں نے وہیں بانٹ دیا۔ دراصل روپیہ کی بات اتنی اہم نہیں۔ لکھنے والے کو پڑھنے والے ملیں تو یہ بہت بڑا معاوضہ ہے۔'' (۲۰)

پندرہ روزہ ''عوامی حالات'' بھیونڈی فروری ۱۹۸۶ء میں ایک خط عصمت چغتائی کا شائع ہوا۔ جو شہناز کے نام ہے۔ مختلف مذاہب میں عورتوں کی حیثیت اس خط کا اہم موضوع ہے۔ عصمت چغتائی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''.........بھئی عورتوں کے لئے جنت تو نہیں ہے شاید دوزخ میں جگہ ہوگی۔ ہندو دھرم عورت کو بچوں اور شودروں کے ساتھ گنتا ہے۔ گیتا میں یہی ہے اور قرآن میں بھی عورتوں پر پابندیاں ہیں۔ مرد چار شادیاں کر سکتا ہے عورت کو مہر دے کر خرید سکتا ہے اس کے باپ بھائی مہر کے حق دار ہوتے ہیں۔ خیر ہندوؤں نے قانون تو بدل بھی لیا مسلمان ڈٹے ہوئے ہیں۔ اور ہندوستان آ کر بیوہ کے نکاح سے منکر ہو گئے۔ عیسائی مذہب تو عورت کو شیطان کی خالہ سمجھتا ہے۔ بس بی بی مریم کو چھوڑ کر ــــ نہایت ناپاک رویہ ہے۔ عیسائی عورت نے تو کبھی کی مذہب کی پابندیاں توڑ دیں۔ اور برابر کا حق حاصل کر لیا یہ پرانے گھسے ہوئے اصول اب نہیں چل سکتے۔ عورت کی ذہنی ساخت ہی بدل گئی ہے۔ بس رنڈی ہی مزے میں ہے جب چاہے جوتے مار کے گاہک کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے ایسی ہی عورت کے گنی گاتا ہے مرد ــــ بھئی بہت جی جلا۔ پڑھ کر۔ عورت کو کسی مذہب میں بھی پناہ نہیں، ہاں! ہندو مائی تھالوجی میں عورت بے دم نہیں برابر کھڑی نظر آتی ہے۔ گریکس میں بھی عورت برابر ہی تھی۔ پھر لینن کی موت کے بعد اس کا بھی پٹرا ہو گیا۔ کئی بار خط لکھنے کا ارادہ کیا دن ہیں

کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار بھاگے چلے جاتے ہیں۔" (۲۱)

آجکل نئی دہلی مارچ ۱۹۸۶ء میں ایک خط ایڈیٹر راج نرائن راز کو لکھا ہے۔ اس خط میں دیوندر اسر کے افسانے "خوشبو بن کر لوٹیں گے" کی تعریف کی ہے اور شرون کمار سے بھی متاثر ہوئی ہیں۔ لکھتی ہیں:

> "پاکستان سے چار ماہ بعد واپسی پر رسالوں کا انبار ردی میں ڈالنے سے پہلے بس اتفاق سے نومبر کا "آجکل" کھول لیا۔ "خوشبو بن کر لوٹیں گے" نے پکڑ لیا۔ کیوں؟ میں تنقید نگار نہیں، عام انسان کی طرح پڑھتی ہوں۔ میرے پاس وہ الفاظ بھی نہیں۔ سوچنا پڑ رہے ہیں، جن کے ذریعے سے متاثر کا اظہار کروں دیوندر اسر سے جیسے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ آگے نہ جانے کتنی بار صفحہ اُلٹ دیا ہوگا۔ اب ہر پرچہ کھول کر انھیں ڈھونڈ رہی ہوں۔" (۲۲)

ابھی عصمت کے سارے خطوط کی فراہمی کا باقاعدہ کام شروع نہیں ہوا اور اسی لئے وہ مرتب شکل میں ہمارے سامنے نہیں ہیں لیکن ان کے جو خطوط بھی دستیاب ہیں، ان سے ان کے ادبی خط و خال بھی واضح ہو جاتے ہیں اور ان کی شخصیت کے نقوش بھی ابھرتے ہیں۔

☆☆

حوالے اور حواشی

باب اول

۱۔ اردو ڈراما روایت اور تجزیہ — ڈاکٹر عطیہ نشاط — ص ۱۵
نصرت پبلشرز لکھنؤ — جولائی ۱۹۷۳

۲۔ مقالہ ''ڈراما نگاری'' — عبدالمغنی — ص ۴۱
آجکل ماہنامہ، نئی دہلی — اگست ۱۹۷۹ء

۳۔ اردو میں ڈراما نگاری — سید بادشاہ حسین حیدرآبادی — ص ۲۷
اعتقاد پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ — پانچواں ۱۹۸۰ء

۴۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر سلام سندیلوی — ص ۲۸۰
نسیم بک ڈپو لکھنؤ — پانچواں ۱۹۸۰ء

۵۔ اردو ڈراما تاریخ و تنقید — عشرت رحمانی — ص ۳۱۸
اردو مرکز لاہور — باراول ۱۹۵۷ء

۶۔ دھانی بانکیں — عصمت چغتائی — ص ۹
کتب پبلشرز بمبئی — باراول ۱۹۴۷ء

۷۔ دھانی بانکیں — عصمت چغتائی — ص ۲۶
کتب پبلشرز بمبئی — باراول ۱۹۴۷ء

۸۔ دھانی بانکیں — عصمت چغتائی — ص ۶۷۔۶۶
کتب پبلشرز بمبئی — باراول ۱۹۴۷ء

۹۔ مقالہ ''دھانی بانکیں'' — ممتاز حسین — ص ۷۲
نیا ادب ماہنامہ لکھنؤ — اگست ۱۹۴۸ء

۱۰۔ ڈراما ''تصویریں''۔ مشمولہ ''شیطان'' عصمت چغتائی — ص ۷۵
نیا ادارہ لاہور — باراول سن ندارد

۱۱۔ڈراما ''تصویریں''۔مشمولہ ''شیطان'' عصمت چغتائی ص ۷۵
نیا ادارہ لاہور بار اول سن ندارد

۱۲۔ڈراما ''تصویریں''۔مشمولہ ''شیطان'' عصمت چغتائی ص ۷۵
نیا ادارہ لاہور بار اول سن ندارد

۱۳۔ڈراما ''تصویریں''۔مشمولہ ''شیطان'' عصمت چغتائی ص ۷۹
نیا ادارہ لاہور بار اول سن ندارد

۱۴۔ڈراما ''دلہن کیسی ہے؟'' مشمولہ ''شیطان'' عصمت چغتائی ص ۱۱۰
نیا ادارہ لاہور بار اول سن ندارد

۱۵۔ڈراما ''دلہن کیسی ہے؟'' مشمولہ ''شیطان'' عصمت چغتائی ص ۱۱۱
نیا ادارہ لاہور بار اول سن ندارد

۱۶۔ڈراما ''شامت اعمال''۔مشمولہ شیطان'' عصمت چغتائی ص ۱۱۴
نیا ادارہ لاہور بار اول سن ندارد

۱۷۔ڈراما ''شامت اعمال''۔مشمولہ شیطان'' عصمت چغتائی ص ۱۴۳
نیا ادارہ لاہور بار اول سن ندارد

۱۸۔ڈراما ''انتخاب'' مشمولہ ''کلیاں'' عصمت چغتائی ص ۴۳
آزاد کتاب گھر دہلی بار اول ۱۹۶۳ء

۱۹۔ڈراما ''انتخاب'' مشمولہ ''کلیاں'' عصمت چغتائی ص ۶۰
آزاد کتاب گھر دہلی بار اول ۱۹۶۳ء

۲۰۔ڈراما ''سانپ'' مشمولہ ''کلیاں'' عصمت چغتائی ص ۱۰۱
آزاد کتاب گھر دہلی بار اول ۱۹۶۳ء

۲۱۔ڈراما ''سانپ'' مشمولہ ''کلیاں'' عصمت چغتائی ص ۱۰۳
آزاد کتاب گھر دہلی بار اول ۱۹۶۳ء

۲۲۔ڈراما ''سانپ مشمولہ ''کلیاں'' عصمت چغتائی ص ۱۰۸
آزاد کتاب گھر دہلی بار اول ۱۹۶۳ء

۲۳۔ڈراما ''فسادی'' مشمولہ ''کلیاں'' عصمت چغتائی ص ۱۳۷
آزاد کتاب گھر دہلی بار اول ۱۹۶۳ء
۲۴۔ڈراما ''فسادی'' مشمولہ ''کلیاں'' عصمت چغتائی ص ۱۵۵
آزاد کتاب گھر دہلی بار اول ۱۹۶۳ء
۲۵۔ڈراما ''فسادی'' مشمولہ ''کلیاں'' عصمت چغتائی ص ۱۵۵۔۱۵۶
آزاد کتاب گھر دہلی بار اول ۱۹۶۳ء
۲۶۔ڈراما ''ننھے'' مشمولہ ''کلیاں'' عصمت چغتائی ص ۲۰۹
آزاد کتاب گھر دہلی بار اول ۱۹۶۳ء
۲۷۔ڈراما ''ننھے'' مشمولہ ''کلیاں'' عصمت چغتائی ص ۲۰۸
آزاد کتاب گھر دہلی بار اول ۱۹۶۳ء
۲۸۔ڈراما ''ننھے'' مشمولہ ''کلیاں'' عصمت چغتائی ص ۲۱۳۔۲۱۴
آزاد کتاب گھر دہلی بار اول ۱۹۶۳ء
۲۹۔ڈراما ''ننھے'' مشمولہ ''کلیاں'' عصمت چغتائی ص ۲۲۳۔۲۲۴
آزاد کتاب گھر دہلی بار اول ۱۹۶۳ء
۳۰۔ڈراما ''عورت اور مرد'' مشمولہ ''چوٹیں'' عصمت چغتائی ص ۲۲۵۔۲۲۶
ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ ۱۹۸۴ء
۳۱۔ڈراما ''دوزخ'' عصمت چغتائی ص ۱۱۹
مطبوعہ ماہنامہ ''سویرا'' لاہور بار اول Vol۔۲۲
۳۲۔ڈراما ''دوزخ'' عصمت چغتائی ص ۱۲۰۔۱۲۱
مطبوعہ ماہنامہ ''سویرا'' لاہور بار اول vol۔۲۲
۳۳۔ڈراما ''دوزخ'' عصمت چغتائی ص ۱۳۰۔۱۳۱
مطبوعہ ماہنامہ ''سویرا'' لاہور vol۔۲۲

باب دوم

۱۔اردو ادب میں خاکہ نگاری ڈاکٹر صابرہ سعید ص ۹
مکتبۂ شعر و حکمت حیدرآباد باراول ۱۹۷۷ء

۲۔مقالہ ''خاکہ نگاری'' سید محمد حسنین ص ۱۸
مطبوعہ نیا دور ماہنامہ لکھنو اکتوبر ۱۹۶۴ء

۳۔بحوالہ اردو ادب میں خاکہ نگاری ڈاکٹر صابرہ سعید ص ۱۶۳
مکتبۂ شعر و حکمت حیدرآباد باراول ۱۹۷۷ء

۴۔بحوالہ اردو ادب میں خاکہ نگاری ڈاکٹر صابرہ سعید ص ۲۲۴۔۲۲۵
مکتبۂ شعر و حکمت حیدرآباد باراول ۱۹۷۷ء

۵۔بحوالہ اردو افسانہ روایت و مسائل مرتبہ گوپی چند نارنگ ص ۱۱۲
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی باراول ۱۹۸۱ء

۶۔اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۲۳۹
ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ باردوم ۱۹۷۹ء

۷۔بحوالہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۲۳۹
ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ باردوم ۱۹۷۹ء

۹۔خاکہ ''دوزخی'' مشمولہ ''چوٹیں'' عصمت چغتائی ص ۱۶۲۔۱۶۳
ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ باردوم ۱۹۸۲ء

۹۔اردو ادب میں خاکہ نگاری ڈاکٹر صابرہ سعید ص ۲۲۹
مکتبۂ شعر و حکمت حیدرآباد باراول ۱۹۷۷ء

۱۰۔دیدۂ دریافت نثار احمد فاروقی ص ۶۸
آزاد کتاب گھر دہلی باراول ۱۹۶۴ء

۱۱۔ خاکہ ''عشق مجازی'' عصمت چغتائی ص ۴۳
مطبوعہ شاہراہ مجاز نمبر دہلی مارچ ۱۹۵۶ء
۱۲۔ خاکہ ''اور وہ'' عصمت چغتائی ص ۱۰
مطبوعہ نیا دور ماہنامہ کراچی مارچ۔اپریل ۱۹۵۶ء
۱۳۔ خاکہ ''منٹو میرا دوست میرا دشمن'' عصمت چغتائی ص ۸۔۷
اردو کے بہترین افسانے مرتبہ پرکاش پنڈت سن ندارد
۱۴۔ خاکہ ''منٹو میرا دوست میرا دشمن'' عصمت چغتائی ص ۲۴۔۲۳
اردو کے بہترین افسانے مرتبہ پرکاش پنڈت سن ندارد
۱۵۔ خاکہ ''منٹو میرا دوست میرا دشمن'' عصمت چغتائی ص ۲۸۔۲۷
اردو کے بہترین افسانے مرتبہ پرکاش پنڈت سن ندارد
۱۶۔ خاکہ ''منٹو میرا دوست میرا دشمن'' عصمت چغتائی ص ۳۱۔۳۰
اردو کے بہترین افسانے مرتبہ پرکاش پنڈت سن ندارد
۱۷۔ خاکہ ''خواجہ احمد عباس'' عصمت چغتائی ص ۱۸۴
اردو کے بہترین افسانے مرتبہ پرکاش پنڈت سن ندارد
۱۸۔ خاکہ ''خواجہ احمد عباس'' عصمت چغتائی ص ۱۸۷
اردو کے بہترین افسانے مرتبہ پرکاش پنڈت سن ندارد
۱۹۔ خاکہ ''خواجہ احمد عباس'' عصمت چغتائی ص ۱۸۷
اردو کے بہترین افسانے مرتبہ پرکاش پنڈت سن ندارد
۲۰۔ خاکہ ''خواجہ احمد عباس'' عصمت چغتائی ص ۱۸۹
اردو کے بہترین افسانے مرتبہ پرکاش پنڈت سن ندارد
۲۱۔ خاکہ ''خواجہ احمد عباس'' عصمت چغتائی ص ۱۹۰۔۱۹۱
اردو کے بہترین افسانے مرتبہ پرکاش پنڈت سن ندارد
۲۲۔ خاکہ ''چراغ روشن ہیں'' عصمت چغتائی ص ۱۰۹۔۱۱۰
مشمولہ ''آدھی عورت آدھا خواب'' بیسویں صدی پبلی کیشن دہلی بار اول ۱۹۸۶

۲۳۔خاکہ ''چراغ روشن ہیں'' عصمت چغتائی ص ۱۲۲۔۱۲۳
بیسویں صدی پبلی کیشن دہلی بار اول ۱۹۸۶ء

۲۴۔خاکہ ''چراغ روشن ہیں'' عصمت چغتائی ص ۱۳۴
بیسویں صدی پبلی کیشن دہلی بار اول ۱۹۸۶ء

۲۵۔خاکہ ''چراغ روشن ہیں'' عصمت چغتائی ص ۱۳۰۔۱۳۱
بیسویں صدی پبلی کیشن دہلی بار اول ۱۹۸۶ء

۲۶۔خاکہ ''چراغ روشن ہیں'' عصمت چغتائی ص ۱۳۳۔۱۳۴
بیسویں صدی پبلی کیشن دہلی بار اول ۱۹۸۶ء

۲۷۔خاکہ ''چراغ روشن ہیں'' عصمت چغتائی ص ۱۳۷۔۱۳۸
بیسویں صدی پبلی کیشن دہلی بار اول ۱۹۸۶ء

۲۸۔خاکہ ''خوابوں کا شہزادہ'' عصمت چغتائی ص ۱۰
مطبوعہ پندرہ روزہ ''چنگاری'' دہلی نومبر ۱۹۸۳ء

۲۹۔خاکہ ''خوابوں کا شہزادہ'' عصمت چغتائی ص ۱۰
مطبوعہ پندرہ روزہ ''چنگاری'' دہلی نومبر ۱۹۸۳ء

۳۰۔خاکہ ''خوابوں کا شہزادہ'' عصمت چغتائی ص ۱۱
مطبوعہ پندرہ روزہ ''چنگاری'' دہلی نومبر ۱۹۸۳ء

۳۱۔خاکہ ''خوابوں کا شہزادہ'' عصمت چغتائی ص ۱۱
مطبوعہ پندرہ روزہ ''چنگاری'' دہلی نومبر ۱۹۸۳ء

۳۲۔خاکہ ''خوابوں کا شہزادہ'' عصمت چغتائی ص ۱۲
مطبوعہ پندرہ روزہ ''چنگاری'' دہلی نومبر ۱۹۸۳ء

۳۳۔خاکہ ''خوابوں کا شہزادہ'' عصمت چغتائی ص ۱۲
مطبوعہ پندرہ روزہ ''چنگاری'' دہلی نومبر ۱۹۸۳ء

۳۴۔خاکہ ''خوابوں کا شہزادہ'' عصمت چغتائی ص ۱۳
مطبوعہ پندرہ روزہ ''چنگاری'' دہلی نومبر ۱۹۸۳ء

۳۵۔ خاکہ ''خوابوں کا شہزادہ'' عصمت چغتائی ص ۱۳
مطبوعہ پندرہ روزہ ''چنگاری'' دہلی نومبر ۱۹۸۳ء

۳۶۔ خاکہ ''خوابوں کا شہزادہ'' عصمت چغتائی ص ۱۳
مطبوعہ پندرہ روزہ ''چنگاری'' دہلی نومبر ۱۹۸۳ء

۳۷۔ عصمت چغتائی فن اور شخصیت جگدیش چندر ودھان ص ۳۱۰
مہرہ آفسیٹ پریس دہلی باراول ۱۹۹۶ء

۳۸۔ تنقیدی مضامین پطرس بخاری ص ۸۹
ادبی دنیا دہلی باراول ۱۹۸۳ء

۳۹۔ عصمت چغتائی فن اور شخصیت جگدیش چندر ودھاون ص ۳۱۳
مہرہ آفسیٹ پریس باراول ۱۹۹۶ء

۴۰۔ عصمت چغتائی فن اور شخصیت جگدیش چندر ودھاون ص ۳۱۵
مہرہ آفسیٹ پریس باراول ۱۹۹۶ء

۴۱۔ عصمت چغتائی فن اور شخصیت جگدیش چندر ودھاون ص ۳۱۶۔۳۱۷
مہرہ آفسیٹ پریس باراول ۱۹۹۶ء

باب سوم

۱۔ رپورتاژ ''بمبئی سے بھوپال تک''	عصمت چغتائی	ص ۶۴	
مشمولہ ''چھوئی موئی''	کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی		باراول جنوری ۱۹۴۷ء
۲۔ رپورتاژ ''بمبئی سے بھوپال تک''	عصمت چغتائی	ص ۶۵	
	کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی		باراول جنوری ۱۹۴۷
۳۔ //	عصمت چغتائی	ص ۶۷	
	کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی	//	//
۴۔ //	عصمت چغتائی	ص ۶۸	
	کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی	//	//
۵۔ //	عصمت چغتائی	ص ۷۵	
	کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی	//	//
۶۔ //	عصمت چغتائی	ص ۷۶۔۷۷	
	کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی	//	//
۷۔ //	عصمت چغتائی	ص ۸۱	
	کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی	//	//
۸۔ //	عصمت چغتائی	ص ۸۴	
	کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی	//	//
۹۔ خاکہ ''چراغ روشن ہیں''	عصمت چغتائی	ص ۱۳۶	
مشمولہ ''آدھی عورت آدھا خواب''	بیسویں صدی پبلی کیشن دہلی		باراول ۱۹۸۶ء
۱۰۔ //	عصمت چغتائی	ص ۱۳۶	
	بیسویں صدی پبلی کیشن دہلی	//	//

باب چہارم

۱۔اردو میں خودنوشت سوانح حیات ڈاکٹر صبیحہ انور ص ۲۱
نامی پریس لکھنؤ بار اول ۱۹۸۲ء
۲۔ 〃 ڈاکٹر صبیحہ انور ص ۲۰
نامی پریس لکھنؤ بار اول ۱۹۸۲ء
۳۔ 〃 ڈاکٹر صبیحہ انور ص ۳۶۷
نامی پریس لکھنؤ بار اول ۱۹۸۲ء
۴۔محمل مرتبہ محمد الدین موحد بدایونی ص ۱۶
نظامی پریس ایجنسی بدایوں بار اول ۱۹۴۷ء
۵۔گفت وشنید ظفر ادیب ص ۱۳۱
قصر اردو دہلی بار اول ۱۹۶۷ء
۶۔آپ بیتی۔''عصمت چغتائی'' عصمت چغتائی ص ۱۰۲۷
مطبوعہ نقوش آپ بیتی نمبر لاہور جون ۱۹۶۴ء
۷۔ 〃 عصمت چغتائی ص ۱۰۲۹
مطبوعہ نقوش آپ بیتی نمبر لاہور جون ۱۹۶۴ء
۸۔''بیتے ہوئے دن کچھ ایسے ہیں'' عصمت چغتائی ص ۳۶
ویمنز کالج میگزین علیگڑھ اپریل ۱۹۶۶ء
۹۔''غبار کارواں'' عصمت چغتائی ص ۶
آجکل دہلی نومبر ۱۹۷۱ء
۱۰۔میرے زمانے کا علی گڑھ عصمت چغتائی ص ۱۰
آجکل دہلی اپریل ۱۹۷۱ء

۱۱۔ اردو میں خودنوشت سوانح حیات ڈاکٹر صبیحہ انور ص ۳۶۸
نامی پریس لکھنؤ بار اول ۱۹۸۲ء

۱۲۔ خودنوشت'' کاغذی ہے پیرہن'' عصمت چغتائی ص ۲۶
''ادھوری عورت'' آجکل دہلی اگست ۱۹۷۲ء

۱۳۔ خودنوشت۔'' کاغذی ہے پیرہن'' عصمت چغتائی ص ۴۴
''پھر علی گڑھ چھوٹا'' آجکل دہلی اگست ۱۹۷۹ء

۱۴۔ خودنوشت۔ کاغذی ہے پیرہن عصمت چغتائی ص ۳۰
''لوہے کے چنے'' آجکل دہلی ستمبر ۱۹۷۹ء

۱۵۔ خودنوشت۔'' کاغذی ہے پیرہن'' عصمت چغتائی ص ۲۸
''علی گڑھ'' آجکل دہلی اکتوبر ۱۹۷۹ء

۱۶۔ خودنوشت۔'' کاغذی ہے پیرہن'' عصمت چغتائی ص ۲۹
''سوجت'' آجکل دہلی نومبر ۱۹۷۹ء

۱۷۔ خودنوشت۔'' کاغذی ہے پیرہن'' عصمت چغتائی ص ۱۰
''سونے کا انڈا'' آجکل دہلی دسمبر ۱۹۷۹ء

۱۸۔ خودنوشت'' کاغذی ہے پیرہن'' عصمت چغتائی ص ۳۲
''الٹے بانس بریلی'' آجکل دہلی جنوری ۱۹۸۰ء

۱۹۔ خودنوشت۔ کاغذی ہے پیرہن عصمت چغتائی ص ۱۳
''تالے'' آجکل دہلی فروری ۱۹۸۰ء

۲۰۔ خودنوشت۔ کاغذی ہے پیرہن عصمت چغتائی ص ۲۰
''تعلیم نسواں۔ ایک وبال'' آجکل دہلی مارچ ۱۹۸۰ء

۲۱۔ خودنوشت۔'' کاغذی ہے پیرہن'' عصمت چغتائی ص ۱۷
''جہنم'' آجکل دہلی اپریل ۱۹۸۰ء

۲۲۔ خودنوشت'' کاغذی پیرہن'' عصمت چغتائی ص ۲۱
''روشنی۔ روشنی۔ روشنی۔'' آجکل نئی دہلی مئی ۱۹۸۰ء

۲۳۔ خودنوشت۔ ''کاغذی ہے پیرہن'' عصمت چغتائی ص ۲۲
روشنی۔ روشنی۔ روشنی۔'' آجکل نئی دہلی مئی ۱۹۸۰ء

۲۴۔ خودنوشت۔ کاغذی ہے پیرہن عصمت چغتائی ص ۲۳
''روشنی۔ روشنی۔ روشنی'' آجکل نئی دہلی مئی ۱۹۸۰ء

۲۵۔ ''میری آپ بیتی'' عصمت چغتائی ص ۱۵۔۱۴
مشمولہ۔ آدھی عورت آدھا خواب بیسویں صدی پبلی کیشن نئی دہلی باراول ۱۹۸۶ء

۲۶۔ // عصمت چغتائی ص ۲۴
بیسویں صدی پبلی کیشن نئی دہلی باراول ۱۹۸۶ء

۲۷۔ // عصمت چغتائی ص ۲۷
بیسویں صدی پبلی کیشن نئی دہلی باراول ۱۹۸۶ء

باب پنجم

۱۔مضمون ''ایک بات''	عصمت چغتائی	ص ۹
مشمولہ مجموعہ (ایک بات)	نیاادارہ	لاہور دوسراایڈیشن
۲۔ //	عصمت چغتائی	ص ۱۱۔۱۰
	نیاادارہ	لاہور دوسراایڈیشن
۳۔ //	عصمت چغتائی	ص ۱۲۔۱۱
	نیاادارہ	لاہور دوسراایڈیشن
۴۔ //	عصمت چغتائی	ص ۱۴۔۱۳
	نیاادارہ	لاہور دوسراایڈیشن
۵۔ //	عصمت چغتائی	ص ۱۶
	نیاادارہ	لاہور دوسراایڈیشن
۶۔ //	عصمت چغتائی	ص ۱۸۔۱۷
	نیاادارہ	لاہور دوسراایڈیشن
۷۔مضمون ''ہیرئن''	عصمت چغتائی	ص ۱۰۷
مشمولہ مجموعہ (ایک بات)	نیاادارہ	لاہور دوسراایڈیشن
۸۔ //	عصمت چغتائی	ص ۱۰۹۔۱۰۸
	نیاادارہ	لاہور دوسراایڈیشن
۹۔ //	عصمت چغتائی	ص ۱۲۱۔۱۲۰
	نیاادارہ	لاہور دوسراایڈیشن
۱۰۔ //	عصمت چغتائی	ص ۱۲۱
	نیاادارہ	لاہور دوسراایڈیشن

۱۱۔ مضمون ''کہانی''　عصمت چغتائی　ص ۱۰۔۹
مشمولہ مجموعہ (چھوئی موئی) کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی　جنوری ۱۹۴۷ء

۱۲۔ //　عصمت چغتائی　ص ۱۰
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی　جنوری ۱۹۴۷ء

۱۳۔ //　عصمت چغتائی　ص ۱۵
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی　جنوری ۱۹۴۷ء

۱۴۔ //　عصمت چغتائی　ص ۱۷۔۱۶
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی　جنوری ۱۹۴۷ء

۱۵۔ //　عصمت چغتائی　ص ۱۷
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی　جنوری ۱۹۴۷ء

۱۶۔ مضمون فسادات اور ادب　عصمت چغتائی　ص ۱۹۔۱۸
مشمولہ مجموعہ (چھوئی موئی) کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی　جنوری ۱۹۴۷ء

۱۷۔ //　عصمت چغتائی　ص ۱۹
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی　جنوری ۱۹۴۷ء

۱۸۔ //　عصمت چغتائی　ص ۳۶
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی　جنوری ۱۹۴۷ء

۱۹۔ مضمون ''کدھر جائیں؟''　عصمت چغتائی　ص ۱۰۸۔۱۰۷
مشمولہ مجموعہ (چھوئی موئی) کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی　جنوری ۱۹۴۷ء

۲۰۔ //　عصمت چغتائی　ص ۱۱۱
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی　جنوری ۱۹۴۷ء

۲۱۔ //　عصمت چغتائی　ص ۱۱۴
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی　جنوری ۱۹۴۷ء

۲۲۔ //　عصمت چغتائی　ص ۱۲۰۔۱۱۹۔۱۱۸
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی　جنوری ۱۹۴۷ء

۲۳۔ مضمون ''پوم پوم ڈارلنگ'' عصمت چغتائی ص ۱۳۸۔۱۳۷۔۱۳۶
مشمولہ مجموعہ (چھوئی موئی) کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی جنوری ۱۹۴۷ء

۲۴۔ // عصمت چغتائی ص ۱۴۱۔۱۴۰
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی جنوری ۱۹۴۷ء

۲۵۔ // عصمت چغتائی ص ۱۴۸۔۱۴۷۔۱۴۶
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی جنوری ۱۹۴۷ء

۲۶۔ // عصمت چغتائی ص ۱۴۶
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی جنوری ۱۹۴۷ء

۲۷۔ // عصمت چغتائی ص ۱۵۴
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی جنوری ۱۹۴۷ء

۲۸۔ مضمون ''یہ بچے'' عصمت چغتائی ص ۱۹۶
مشمولہ مجموعہ (چھوئی موئی) کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی جنوری ۱۹۴۷ء

۲۹۔ // عصمت چغتائی ص ۱۹۹۔۱۹۸۔۱۹۷
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی جنوری ۱۹۴۷ء

۳۰۔ // عصمت چغتائی ص ۲۰۰۔۱۹۹
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی جنوری ۱۹۴۷ء

۳۱۔ // عصمت چغتائی ص ۲۰۱
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی جنوری ۱۹۴۷ء

۳۲۔ // عصمت چغتائی ص ۲۰۲۔۲۰۱
کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی جنوری ۱۹۴۷ء

۳۳۔ مضمون ''عورت ایک کھلونا'' عصمت چغتائی ص ۱۰
مطبوعہ قومی راج بمبئی اکتوبر ۱۹۷۵ء

۳۴۔ // عصمت چغتائی ص ۱۰
مطبوعہ قومی راج بمبئی اکتوبر ۱۹۷۵ء

۳۵۔ // عصمت چغتائی ص ۱۰
مطبوعہ قومی راج بمبئی اکتوبر ۱۹۷۵ء
۳۶۔ // عصمت چغتائی ص ۱۱
مطبوعہ قومی راج بمبئی اکتوبر ۱۹۷۵ء
۳۷۔ مضمون ''نئی تصویر عورت کی'' عصمت چغتائی ص ۶۳
منورما (ہندی) ماہنامہ دہلی جولائی ۱۹۸۵ء
۳۸۔ // عصمت چغتائی ص ۶۳
منورما (ہندی) ماہنامہ دہلی جولائی ۱۹۸۵ء
۳۹۔ مضمون ''آدھی عورت آدھا خواب'' عصمت چغتائی ص ۲۷
ماہنامہ بیسویں صدی پبلی کیشن دہلی باراول ۱۹۸۶
۴۰۔ // عصمت چغتائی ص ۲۸
ماہنامہ بیسویں صدی پبلی کیشن دہلی باراول ۱۹۸۶ء
۴۱۔ // عصمت چغتائی ص ۳۲
ماہنامہ بیسویں صدی پبلی کیشن دہلی باراول ۱۹۸۶ء
۴۲۔ // عصمت چغتائی ص ۳۸۔۲۷
ماہنامہ بیسویں صدی پبلی کیشن دہلی باراول ۱۹۸۶ء

باب ششم

۱۔ مکاتیب احسن مرتبین ڈاکٹر عنوان چشتی صغیر احسن جلال آبادی ص ۴۶
اردو سماج نئی دہلی بار اول ۱۹۷۷ء

۲۔ مقالہ ''خطوط نگاری کا فن'' ڈاکٹر فہمیدہ کبیر ص ۲۴
مطبوعہ آواز (پندرہ روزہ) دہلی یکم اپریل ۱۹۸۳ء

۳۔ // ڈاکٹر فہمیدہ کبیر ص ۲۴
مطبوعہ آواز (پندرہ روزہ) دہلی یکم اپریل ۱۹۸۳ء

۴۔ بعنوان ''شاہد لطیف کی شادی'' عصمت چغتائی ص ۳۷۰
ماہنامہ نقوش افسانہ نمبر لاہور جنوری ۱۹۵۶ء

۵۔ // عصمت چغتائی ص ۳۷۱
ماہنامہ نقوش افسانہ نمبر لاہور جنوری ۱۹۵۶ء

۶۔ بعنوان (کیا موجودہ ادب میں تنزل ہے) عصمت چغتائی ص ۲۹۷
ماہنامہ نقوش خاص نمبر لاہور دسمبر ۱۹۵۹ء

۷۔ // عصمت چغتائی ص ۲۹۸
ماہنامہ نقوش خاص نمبر لاہور دسمبر ۱۹۵۹ء

۸۔ // عصمت چغتائی ص ۲۹۸
ماہنامہ نقوش خاص نمبر لاہور دسمبر ۱۹۵۹ء

۹۔ // عصمت چغتائی ص ۲۹۸
ماہنامہ نقوش خاص نمبر لاہور دسمبر ۱۹۵۹ء

۱۰۔ خط بعنوان جوش صاحب عصمت چغتائی ص ۲۷
ماہنامہ افکار ''جوش نمبر'' کراچی اکتوبر نومبر ۱۹۶۱ء

۱۱۔ ''ایک خط'' عصمت چغتائی ص ۵۳۸
ماہنامہ نقوش لاہور نومبر ۱۹۶۴ء

۱۲۔ ''بنام واجدہ تبسم'' عصمت چغتائی ص ۴۰۹
ماہنامہ نقوش خطوط نمبر لاہور ۔ اپریل، مئی ۱۹۶۸ء

۱۳۔ // عصمت چغتائی ص ۴۰۹
ماہنامہ نقوش خطوط نمبر لاہور اپریل، مئی ۱۹۶۸ء

۱۴۔ // عصمت چغتائی ص ۴۱۲
ماہنامہ نقوش خطوط نمبر لاہور اپریل، مئی ۱۹۶۸ء

۱۵۔ /// عصمت چغتائی ص ۴۱۲
ماہنامہ نقوش خطوط نمبر لاہور اپریل، مئی ۱۹۶۸ء

۱۶۔ // عصمت چغتائی ص ۴۱۳
ماہنامہ نقوش خطوط نمبر لاہور اپریل، مئی ۱۹۶۸ء

۱۷۔ // عصمت چغتائی ص ۴۱۵۔۴۱۴
ماہنامہ نقوش خطوط نمبر لاہور اپریل، مئی ۱۹۶۸ء

۱۸۔ عصمت چغتائی کے دو غیر مطبوعہ خطوط'' عصمت چغتائی ص ۴۰
مطبوعہ عبداللہ ہال، ریویو علی گڑھ اپریل، مئی ۱۹۸۰ء

۱۹۔ ''ایڈیٹر بیسویں صدی کے نام کھلا خط'' عصمت چغتائی ص ۱۰
بیسویں صدی ماہنامہ نئی دہلی مئی ۱۹۸۴ء

۲۰۔ ''سلسلہ سوالوں کا'' عصمت چغتائی ص ۴۸
ماہنامہ آجکل نئی دہلی نومبر ۱۹۸۵ء

۲۱۔ ''بنام شہناز'' عصمت چغتائی ص ۶
عوامی حالات (پندرہ روزہ) بھیونڈی فروری ۱۹۸۴ء

۲۲۔ ''مکتوبات'' عصمت چغتائی ص ۴۷
ماہنامہ آجکل نئی دہلی مارچ ۱۹۹۲

کتابیات

مطبوعات

۱۔ آدھی عورت آدھا خواب — عصمت چغتائی — بیسویں صدی پبلی کیشن دہلی — باراول ۱۹۸۶ء

۲۔ اردو ڈراما روایت اور تجزیہ — ڈاکٹر عطیہ نشاط — نصرت پبلشرز ہاؤس لکھنؤ — باراول جولائی ۱۹۷۳ء

۳۔ اردو ڈراما نگاری — سید بادشاہ حسین — اعتقاد پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ — پانچواں ۱۹۸۰ء

۴۔ اردو ڈراما تاریخ و تنقید — عشرت رحمانی — اردو مرکز لاہور — باراول ۱۹۵۷ء

۵۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری — ڈاکٹر صابرہ سعید — مکتبہ شعر و حکمت حیدر آباد — باراول ۱۹۷۷ء

۶۔ اردو افسانہ روایت و مسائل — مرتبہ گوپی چند نارنگ — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی — باراول ۱۹۸۱ء

۷۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی — ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ — دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۹ء

۸۔ اردو کے بہترین افسانے — مرتبہ پرکاش پنڈت دہلی

۹۔ اردو میں خودنوشت سوانح حیات — ڈاکٹر صبیحہ انور — نامی پریس لکھنؤ — باراول ۱۹۸۲ء

۱۰۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر سلام سندیلوی — نسیم بک ڈپو لکھنؤ — پانچواں ۱۹۹۰ء

۱۱۔ ایک بات — عصمت چغتائی — نیا ادارہ لاہور — دوسرا ایڈیشن

۱۲۔ ایک شوہر کی خاطر	عصمت چغتائی	
	روہتاس، بکس لاہور	۱۹۹۲ء
۱۳۔ بڑی شرم کی بات	عصمت چغتائی	
	روہتاس، بکس لاہور	۱۹۹۲ء
۱۴۔ تنقیدی مضامین	پطرس بخاری	
	ادبی دنیا دہلی	۱۹۸۳ء
۱۵۔ چوٹیں	عصمت چغتائی	
	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۸۲ء
۱۶۔ چھوئی موئی	عصمت چغتائی	
	کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی	جنوری بار اول ۱۹۴۷ء
۱۷۔ دھانی بانکیں	عصمت چغتائی	
	کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی	جون بار اول ۱۹۴۷ء
۱۸۔ شیطان	عصمت چغتائی	
	نیا ادارہ لاہور	بار اول
۱۹۔ عصمت چغتائی فن اور شخصیت	جگدیش چندر ودھاون	
	مہرہ آفسیٹ پریس نئی دہلی	بار اول ۱۹۹۶ء
۲۰۔ کلیاں	عصمت چغتائی	
	آزاد کتاب گھر دہلی	بار اول ۱۹۶۳ء
۲۱۔ گفت وشنید	ظفر ادیب	
	قصرِ اردو دہلی	بار اول ۱۹۶۷ء
۲۲۔ محمل	محمد دین موجد بدایونی	
	نظامی پریس ایجنسی بدایوں	بار اول ۱۹۴۷ء
۲۳۔ مکاتیب احسن	مرتبین ڈاکٹر عنون چشتی، صغیر احسن جلال آبادی	
	اردو سماج نئی دہلی	بار اول ۱۹۷۷ء

رسائل واخبارات

شمار	نام رسالہ واخبار	مقام اشاعت	تاریخ اشاعت
۱۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	اپریل ۱۹۶۴ء
۲۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	نومبر ۱۹۷۰ء
۳۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	اپریل ۱۹۷۱ء
۴۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	اگست ۱۹۷۲ء
۵۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	اگست ۱۹۷۹ء
۶۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	جولائی ۱۹۷۹ء
۷۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	ستمبر ۱۹۷۹ء
۸۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	اکتوبر ۱۹۷۹ء
۹۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	نومبر ۱۹۷۹ء
۱۰۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	دسمبر ۱۹۷۹ء
۱۱۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	جنوری ۱۹۸۰ء
۱۲۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	فروری ۱۹۸۰ء
۱۳۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	مارچ ۱۹۸۰ء
۱۴۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	اپریل ۱۹۸۰ء
۱۵۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	مئی ۱۹۸۰ء
۱۶۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	مارچ ۱۹۸۴ء
۱۷۔	آجکل (ماہنامہ)	نئی دہلی	اکتوبر ۱۹۸۴ء
۱۸۔	آواز (پندرہ روزہ)	نئی دہلی	یکم اپریل ۱۹۸۳ء
۱۹۔	افکار جوش نمبر	نئی دہلی	اکتوبر، نومبر ۱۹۹۱ء

۲۰۔	بیسویں صدی (ماہنامہ)	نئی دہلی	مئی ۱۹۸۴ء
۲۱۔	چنگاری (پندرہ روزہ)	نئی دہلی	نومبر ۱۹۸۳ء
۲۲۔	سویرا (ماہنامہ)	لاہور (پاکستان)	Vol-۲۲
۲۳۔	شاہراہ مجاز نمبر	دہلی	مارچ ۱۹۵۶ء
۲۴۔	عوامی حالات (پندرہ روزہ	بھیونڈی	فروری ۱۹۸۴ء
۲۵۔	عبداللہ ریویو	علی گڑھ	۱۹۸۰ء
۲۶۔	قومی راج (ماہنامہ)۔	بمبئی	اکتوبر ۱۹۷۵ء
۲۷۔	منورما (ہندی) ماہنامہ	نئی دہلی	جولائی ۱۹۸۵ء
۲۸۔	نقوش (ماہنامہ) ''آپ بیتی نمبر'' لاہور (پاکستان)		جون ۱۹۶۴ء
۲۹۔	نقوش (ماہنامہ) ''افسانہ نمبر'' لاہور (پاکستان)		جنوری ۱۹۵۶ء
۳۰۔	نقوش (ماہنامہ) ''خاص نمبر'' لاہور (پاکستان)		دسمبر ۱۹۵۹ء
۳۱۔	نقوش (ماہنامہ)	لاہور (پاکستان)	نومبر ۱۹۶۴ء
۳۲۔	نقوش (ماہنامہ) ''خطوط نمبر'' لاہور (پاکستان)		اپریل، مئی ۱۹۶۴ء
۳۳۔	نیا ادب (ماہنامہ)	لکھنؤ	اگست ۱۹۴۸ء
۳۴۔	نیا دور (ماہنامہ)	کراچی (پاکستان)	مارچ، اپریل ۱۹۵۶ء
۳۵۔	نیا دور (ماہنامہ)	لکھنؤ	اکتوبر ۱۹۶۴ء
۳۶۔	ویمنز کالج میگزین ''پاپا میاں نمبر'' علی گڑھ		اپریل ۱۹۶۶ء

☆☆

ضمیمہ

انٹرویو

میں نے اپنے تحقیقی مقالے "اردو فکشن کے ارتقا میں عصمت چغتائی کا حصہ" کے لئے مواد کی فراہمی کا جب کام شروع کیا تو میرے نگرانِ کار ڈاکٹر اختر بستوی صاحب نے ہدایت کی کہ مجھے بمبئی جا کر عصمت آپا سے مختلف نکات پر جو ان کی زندگی سے متعلق ہیں گفتگو کرنی چاہئے۔ میں ۱۱؍جولائی ۱۹۸۵ء کو بمبئی پہنچا تھا اور تقریباً ڈیڑھ ماہ وہاں قیام کیا۔ عصمت آپا سے میری پہلی ملاقات ۱۳؍جولائی ۱۹۸۵ء کو ہوئی۔ اس ملاقات کا نقشہ آج بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔

عصمت آپا کے فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر میں نے گھنٹی بجائی تو جواب ملا۔

"کون ہے ...... کیا ہے بھئی۔" "جی میں ہوں اشرف گورکھپور یونیورسٹی سے آرہا ہوں"

آیئے۔آیئے ...... "ارے میں تو باہر ہی نکل رہی تھی" آپا نے پنکھے کا بٹن دبا کر صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور میں بڑے ہی مودبانہ انداز میں کھڑا ہی رہا، لیکن آپا نے پھر بیٹھنے کو کہا تو میں مجبوراً بیٹھ گیا اور بغل میں آپا بھی بیٹھ گئیں۔اور کہا— کیا کام ہے؟" میں نے ڈاکٹر اختر بستوی صاحب کا تعارفی خط ان کے حوالے کیا۔اس وقت ان کا سارا جسم کانپ رہا تھا اور انھوں نے چشمے کو اتار کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔اور خط کو پڑھنے لگیں۔خط پڑھتے ہی کہا—

"اُف" ...... آج کل کے تو جوانوں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔میں نے اتنی بار لوگوں سے کہا کہ اس تحقیقی کام سے کیا فائدہ ہوتا ہے تو سب یہی کہتے ہیں کہ نام کے آگے ڈاکٹر لگا کر کسی طرح روزی روٹی کا سہارا ہو جاتا ہے۔بہت سارے تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ بھلا بتایئے۔قلم کو لوگوں نے روزی روٹی کا ذریعہ

بنالیا ہے۔ بھئی اگر آپ ادیب ہیں تو قلم کا کھل کر استعمال کیجئے اس کا واسطہ روزی روٹی سے جوڑنا کیا مطلب؟ اس بیگ میں تمام سوالنامے پڑے ہیں اور یہاں بہت سارے لوگ آتے ہیں۔ میں نے ہر ایک کو جھٹک دیا۔ بھاگو یہاں سے! ایک ہوں تو ہوں ارے چار چار تحقیق ہو رہی ہے۔ لوگوں نے قلم کو بالکل بیچ ڈالا ہے...... اب کیا کہا جائے۔ ہم لوگوں کے زمانے میں روزی روٹی کی فکر نہ تھی۔ اس وقت مسلمانوں میں اگر لڑکیاں تعلیم یافتہ ہوتیں تو بڑی بات تھی، فوراً ملازمت ملتی تھی۔ مجھے دیکھو میں نے بی۔ اے۔ کیا اور فوراً نوکری مل گئی، مگر اس سے زیادہ روپیہ فلموں سے کمایا۔ آج جسے دیکھو قلم کو روزی روٹی کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ اُف! ارے ہمارے ساتھ کے لوگوں نے تو لکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ میں تو اب بھی لکھ رہی ہوں۔ آجکل میں یہ لکھ رہی ہوں کہ کیسے میں نے لکھنا شروع کیا وغیرہ وغیرہ۔ دیکھو پاکستان میں بھی خوب روپے خرچ کئے جاتے ہیں اور صاحب تحقیق صرف تحقیق...... نہ جانے کیا ہو گیا ہے ان لوگوں کو وہ بڑے موڈ میں تھیں۔ میں ان کی باتوں کو غور سے سن رہا تھا۔ جی آپا کے علاوہ میری زبان سے کچھ نہیں نکلتا تھا...... اچھا تو میں جا رہی ہوں۔ بھئی ابھی ابھی سردار کا فون آیا تھا، میں پیڈر رے سے ہو کر وہاں جاؤں گی۔ اوہ دیکھو میں نے چابی کہاں رکھ دی پرس میں تلاش کیا اور پھر گھر کے اندر گئیں اور اس کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا تو کل آ جاؤ بھئی ـــــ میں نے وقت کے بارے میں پوچھا۔ جواب میں کہا کہ جب چاہو۔ دس بجے کے بعد ملو، یہ تو سردار کا فون آیا اس لئے میں جا رہی ہوں۔ ان کو دیکھ کر میں بھی کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے کہا بیٹھو بیٹھو ـــــ اور کہا کہ پیڈر رے جا رہی ہوں تم کہاں جاؤ گے ـــــ میں نے کہا آپا لوکل ٹرین سے باندرہ چلا جاؤں گا۔ میں باندرہ میں ہی ٹھہرا ہوں۔ آپ جب کہئے میں حاضر ہو جاؤں۔ انھوں نے کہا کہ میں ہر وقت فرصت میں ہوں۔ ارے اب رات میں نیند بھی نہیں آتی ہے۔ میں کہاں سوتی ہوں۔ جب جی میں آئے چلے آنا ـــــ اچھا اچھا اب چلو بھئی مجھے سردار کے ہاں جانا ضروری ہے۔ کمرے سے باہر نکل کر میں نے دروازہ بند کیا اور آپا نے اس دروازہ کو تالا لگا دیا اور اس کے بعد میں اور آپا دونوں ہی زینہ کے نیچے آئے کچھ انھوں نے اپنے فلیٹ کے چوکیدار سے کہا اور اس کے بعد چار زینہ طے کر کے شاہراہ پر آ گئیں۔ اس وقت تک میں ان کے ساتھ تھا، جب وہ ٹیکسی پر بیٹھ گئیں تب ان کو

میں نے آداب کہہ کر باندرھ کے لئے چل پڑا۔لیکن دوسرے ہی دن آپا سے میری دوسری ملاقات ۱۰ بجے صبح ہوئی۔اور گفتگو نیز سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو درج ذیل ہے۔

اشرف: براہ کرم اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ تفصیلات بہم پہنچائے مثلاً یہ کہ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئیں؟

عصمت چغتائی: تاریخ پیدائش ۱۹۱۵ء اور مقامِ پیدائش بدایوں۔

اشرف : اور خاندانی حالات وتعلیم۔

عصمت چغتائی : ہمارے والد بہت روشن خیال تھے۔ ہمارے پہلے بھائی تھے جنھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی۔انھوں نے لڑکیوں کو انگریزی تعلیم دلانے کی کوشش کی۔لیکن خاندان میں اس کی زبردست مخالفت ہوئی۔اور انھوں نے فوراً لڑکیوں کو گھر بلالیا اور جلدی جلدی ان کی شادیاں ہوگئیں اور ابا نے کہا کہ لڑکوں کو فارسی نہیں پڑھاؤں گا،انھیں انگریزی پڑھاؤں گا۔ابا سے میں نے ضد کی کہ میں انگریزی پڑھوں گی اور میں اپنی ضد پر قائم رہی چونکہ بچپن سے ہی میں ضدی طبعیت کی تھی، جو کہتی وہ کرتی اور ابا سے یوں میں نے ضد کرکے علی گڑھ گرلس اسکول میں نام لکھایا اور پھر اس کے بعد میں کالج میں گئی جہاں سے انٹرمیڈیٹ کیا۔اور پھر والد سے بی۔اے کرنے کے لئے اصرار کیا۔انھوں نے پھر میری ایک ضد کو پوری کی اور میرا داخلہ آئی۔ٹی۔کالج لکھنؤ میں ہوگیا۔ جہاں سے میری تعلیم کا صحیح سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یہیں سے میں نے انگریزی کے ادیبوں کو پڑھا،اور سب کے سب میرے دماغ میں چھاگئے۔ان کو ہی پڑھ کر میں نے لکھنا شروع کیا۔اور سب سے پہلے میں نے ڈراما لکھا۔لوگوں کا خیال تھا کہ ڈراما میں برناڈ شا کی کاپی کی گئی ہے،مگر میں ایک ضدی،کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔لوگ کہتے ہیں تو کہیں،میں تو ڈرامے لکھ رہی ہوں۔ارے بھئی میں نے ان سے اور ان کی ہی کتابوں سے لکھنا سیکھا ہے اور ان کے ہی ڈراموں اور تخلیقات کا بغور مطالعہ کرتی رہی ہوں تو پھر ان کا اثر میری تخلیق میں نہیں ہوگا تو کس کا ہوگا۔ جیسا کہ میں نے اوپر بتایا ہے کہ انگریزی کتابوں نے مجھے روشن خیال بنایا اور ان کی تقلید نے میری رہنمائی کی۔اگر ایسا ہے تو ہو۔اس کے علاوہ اردو کی تعلیم جو گھروں میں رسائل و کتابوں سے ملتی تھی،اسے پڑھا کرتی چونکہ میرا جھکاؤ زیادہ تر اردو کی طرف تھا،راشد الخیری

کے علاوہ دیگر اردو مصنفین کی تخلیقات کو پڑھا کرتی تھی جس سے اردو تعلیم میں پختگی آتی گئی۔ انگریزی کتابوں کا مطالعہ شروع سے ہی تھا مگر ان میں روسی رائٹرس اور فرانسیسی اور عام انگریزی رائٹرس کو بھی پڑھا اور رہنمائی یعنی استاد انھیں کتابوں کے رائٹرس تھے جس نے مجھے ایک وسیع النظر بنایا ہے اور لکھنے کا شوق بھی انھیں ادیبوں کی مرہون منت ہے۔ لکھنؤ کی فضا اور لائبریری کی روزانہ کی اسٹڈی نے میرے کو اور ہی زیادہ بلند خیال بنا دیا اور سوچنے کی قوت بھی مجھے اسی ماحول سے ملی۔

بی۔اے۔ پاس کرنے کے بعد میں نے نوکری کی۔ جس کا ماتم اور مخالفت میرے خاندان والوں نے کیا۔ ابا اور اماں بھائیوں اور بہنوں کا مسلسل جھگڑا شروع ہوا۔ میں نے اس کی کوئی پروانہیں کی، اور اس جنگ سے میرا ہمیشہ واسطہ پڑا، لیکن اپنی ضد کو کسی قیمت پر جھکنے نہیں دیا اور میں نے زندگی کی تلخیوں کو بآسانی قبول کیا۔ میرے سامنے کوئی ایسی پریشانی نہیں آئی جس سے میری زندگی کی رفتار اور اس کی ترقی میں کوئی چیز حائل ہوئی ہو۔ میں نے ہر ایک کا مقابلہ جم کر کیا اور اس کے عوض میں خاندان والوں کو مجھے چھوڑنا پڑا تو بھی اس کا غم نہیں۔ میں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اور نوکری کرتی رہی گو کہ میں نے خاندان والوں کو بتا چکی تھی کہ میں خاندان کو چھوڑ دوں گی مگر نوکری نہیں چھوڑوں گی۔ میں اپنی ضد پر قائم تھی۔ پورا گھر کاؤں کاؤں کرتا رہا مگر ایک کی نہ سنی۔ اتنا کاؤں کاؤں ہوا مگر اس اودھم چوکڑی میں کوئی مجھے ہرا نہیں سکا۔ حتیٰ کہ گھر والے میری ضد سے پریشان ہو کر شادی کرنے کے لئے بضد تھے اور ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے مگر میں کسی سے نہیں ڈرتی تھی صرف ابا تھے جو بہت دیر تک میری کہانی سنتے اور کوئی نوٹس نہ لے کر وہ مجھے بلا کر کچھ چپکے سے کہتے اور پھر میں آہستہ سے ان سے کچھ کہتی اور وہ صرف اُف کہہ کر رہ جاتے۔ بھائیوں کا کیا کہنا میری بہنوں میں تو کوئی بات نہیں تھی مگر بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی تھے ان کو کیا وہ صرف دھیرے سے مسکرا دیتے اور خاموش رہتے، یہ سارا ماجرا خاموشی سے دیکھتے رہتے۔ میری شادی گھر والوں نے ۱۲/۱۳ سال کی عمر میں ہی کرنا چاہتے تھے، لیکن میں نے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور پھر پڑھنے کی طرف راغب ہوگئی۔ یہاں تک کہ خاندانی پابندیوں کو پوری طرح سے ترک کر دیا اور فرسودہ رسم ورواج اور پردہ وغیرہ چھوڑ دیا اور بغیر پردے کے گھومنے لگی۔ جب بھی

میں گھر کو جاتی تو ایک چادر اوڑھ لیتی اور ایک چادر کا ہی پردہ تھا، وہ صرف گھر تک ہی محدود تھا۔ کبھی یونیورسٹی میں کوئی رائٹرس وغیرہ آتے یا کوئی پروگرام ہوتا تو میں بغیر پردہ کے جاتی مگر ابا کو یہ معلوم ہوا کہ میں لکچر سننے یا کالج وغیرہ میں بغیر کوئی پردہ کے جاتی ہوں تو مجھے بلایا اور زور سے بگڑے کہ بدتمیز پردہ تم نے کیا کیا؟ نہیں ابا میں تو جب کوئی رائٹر آتا ہے یا یونیورسٹی کا کوئی پروگرام ہوتا ہے تو ایک چادر اوڑھ لیتی ہوں، لیکن تمہارا سر ڈھکتا ہے یا نہیں؟ جی ابا سر سے دوپٹہ اوڑھ لیتی ہوں۔ اچھا اچھا پردہ کا خیال رکھا کرو، لیکن ابا کیا کروں سبھی تو وہاں بغیر پردے کے جاتی ہیں۔ ٹھیک ہے دوپٹہ سر پر رکھا کرو۔

میری اماں تو دستخط کرنا بھی نہیں جانتی تھیں، لیکن ابا جان بی۔ اے۔ کئے ہوئے تھے اور اس زمانے میں جو لوگ بی۔ اے۔ کر لیتے تھے تو بڑی بات سمجھی جاتی تھی اور ہر بی۔ اے۔ کرنے والے کو نوکری بڑی ملتی تھی یعنی جو شخص بی۔ اے۔ کرتا فوراً ڈپٹی کلکٹر بنتا تھا۔ انگریزوں کی بڑی زوردار سیاست تھی وہ ہندوستان میں جب آئے تو انھیں ایک طبقہ کو اونچا اٹھانا تھا اور اس کے مقابلے میں ہندوؤں کو نیچا دکھانا تھا یعنی انگریزوں نے صرف مسلمانوں کو انگریزی تعلیم دینا ضروری سمجھا اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم خاصی مقبول رہی۔ انگریزوں کو چونکہ ہندوستان پر حکومت کرنی تھی، اس لئے اپنی مختلف سیاسی پالیسی کے تحت انگریزی کو ہی آگے بڑھایا۔ اور میرے خاندان میں کچھ بھی نہیں تھا۔

ایک بار گاندھی جی لکھنؤ آئے۔ میں اپنی ہم جماعت طالبات کے ساتھ ان سے آٹوگراف لینے گئی۔ گاندھی جی نے آٹوگراف دینے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ جو بدیشی کپڑا پہنتا ہے اسے ہم آٹوگراف نہیں دیں گے۔ یہ سن کر میں اور میری ہم جماعت طالبات فوراً وہیں پر ایک کھدر کے کپڑوں کی نمائش لگی تھی۔ ایک ایک کھدر کی ساڑی لی۔ اور پھر گاندھی جی کے پاس آٹوگراف لینے گئیں تو بہت خوش ہوئے اور آٹوگراف فوراً دیا—
اس وقت کے تمام کانگریسی لیڈر جیسے جواہر لال نہرو اور گاندھی جی پر میرا وشواس اور یقین تھا۔ ہمارے بھائیوں میں کوئی بھی پاکستان نہیں گیا۔ ایک بھائی ڈھاکہ میں تھے وہ پاکستان گئے، لیکن ان کے سارے بچے ہندوستان میں ہی رہے۔ اور ہندوستان کو ہی اپنا وطن بنایا اور بہت سے رشتہ دار پاکستان چلے گئے۔ میں یہاں اکیلی رہی۔ میری اپنی زندگی پر کوئی ایسا

فرق یا تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔ اور ہمیشہ کی طرح زندگی کا گزر بسر ہوتا رہا اور ہو رہا ہے۔

بھائیوں اور بہنوں کے متعلق تفصیلات: پیدا ہوئے تو بارہ ۱۲ بھائی بہن، لیکن حیات میں صرف دس ۱۰ ہی رہ گئے۔ چھ بھائی اور چار بہن۔ بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی اور میرے بعد عصیم بیگ چغتائی تھے اور عظیم بیگ چغتائی کا تیسرا نمبر تھا۔ اور میرا دسواں نمبر اور عصیم بیگ چغتائی کا گیارہواں نمبر اور اب اس وقت حیات میں میری بڑی بہن ان کا پانچواں نمبر تھا۔ جو آج بھی حیات میں ہیں اور بمبئی میں ہی رہتی ہیں۔ ان کا نام عظمت سراج ہے۔ سراج سے انھوں نے شادی کی۔ میرے دو بچے ہیں اور ان کے پانچ ہیں۔ دونوں کے بچے فلم سے وابستہ ہیں۔ کسی نے کوئی سرکاری مدد نہیں حاصل کی۔

ہمارا خاندان بہت اکڑتا ہے کہ ہمارا شجرہ بادشاہ بابر سے ملتا ہے، اور ہم چغتائی ہیں۔ عبدالرحمٰن چغتائی جو ایک آرٹسٹ تھے وہ بھی چغتائی لگاتے تھے مگر وہ خط میں اکثر لکھتے تھے کہ میں شیخ ہوں، چغتائی نہیں۔ ایک بار پاکستان خاص طور پر اس لئے گئی تاکہ ان سے ملاقات کروں، گو کہ عرصہ سے خط و کتابت ان سے ہوتی تھی مگر ملاقات کبھی نہیں تھی۔ انھوں نے میرے لئے اپنے البم سے دو عدد پن اسکیچ دیے جو میری نظروں میں بہت قیمتی ہیں اور آج بھی میرے پاس موجود ہیں۔

عصیم بیگ چغتائی نے چار شادیاں کیں۔ آخری بیوی کے ساتھ ہی زندگی کے آخری دن گزارے۔ سوئے تو سوئے رہ گئے۔ آج چاروں بیویاں اپنے شوہری حق کے لئے لڑ رہی ہیں۔ ایک تین منزلہ فلیٹ ہے جس کا اوپری حصہ عصیم بیگ کو ملا تھا، آج اس کی لڑائی چاروں بیویوں میں ہو رہی ہے کہ میرا شوہری حق ہے۔ کس کا شوہری حق ہے، اس سے میرا کوئی مطلب نہیں۔ یہاں بھی بیویاں آتی ہیں مگر اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوتی۔ میری ایک بھابی پاکستان ہیں۔ ان سے میری بہت زیادہ محبت تھی، وہ بہت مانتی ہیں، اب تو وہ بوڑھی ہو چلی ہیں۔ اسّی ۸۰ پچاسی ۸۵ کی عمر ہوگی۔

میرے سارے بھائیوں اور بہنوں کی پیدائش مختلف اضلاع میں ہوئی۔ کوئی کانپور، کوئی بریلی، کوئی جے پور، کوئی بہرائچ، کوئی میرٹھ، کوئی بدایوں اور اس طرح ابا جان کے جہاں جہاں تبادلے ہوتے تھے وہاں وہاں سارے بھائیوں اور بہنوں کی پیدائش ہوئی ہے۔

میرے ابا جان انگریزوں کے زمانے کے جج اور کلکٹر تھے۔ شکار میں بہت آگے تھے۔ ہمیشہ شکار کرنے کے لئے جنگلوں میں جاتے، مگر کیا مجال تھی کہ نشانہ خالی جائے۔ جتنی گولیاں ہوتیں اتنی ہی نیل گائیں ہوتیں۔ شکار سے جو کچھ لاتے سب کے سب بانٹ دیتے۔ لوگ ان سے بہت خوش رہتے تھے۔ وہ صرف اپنا شوق پورا کرتے تھے۔ ہاں ایک بار چیتے کا بچہ مارا تھا تو اس کی کھال کو اپنے استعمال میں لیا۔ باقی گوشت کو چھوٹے لوگوں میں تقسیم کردیا۔ میرے ابا کا نام قسیم بیگ چغتائی تھا وہ گریجویٹ تھے اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ زندگی میں اگر کسی نے متاثر کیا خاص طور پر عورتوں میں تو وہ میرا ابائی تھی جو مجھے بہت پسند تھی۔

اشرف : خاندانی حالات اور گھریلو ماحول کے بارے میں آپ سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔

عصمت چغتائی : قریب قریب بڑے مزے کی زندگی رہی۔ کوئی غم اور کوئی احساس کمتری نہیں اور کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس سے میرا کوئی کام رکا ہمیشہ کی طرح آزاد رہتی ہوں۔ اس وقت کا ماحول یہی تھا۔ پڑھا لکھا اور نوکری کی۔ ابا جان اور اماں جان اور بھائیوں کا معاملہ جہاں تک ہے وہ مجھے کچھ نہیں کہتے۔ بس سمجھ لو کہ بڑی شاندار لائف رہی، کوئی اڑچن نہیں رہی اور نہ کوئی تکلیف، زندگی کو جیسا چاہا ویسا گزارا۔ میں نے گھر سے آزادی حاصل کی، پردہ چھوڑا اور صاحب نوکری بھی جم کر کی۔ خاندان رشتہ دار نے اگر میری مخالفت بھی کی تو اس کا میری زندگی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے اپنی زندگی ٹھاٹ سے گزاری اور آج بھی گزار رہی ہوں اور گزاروں گی۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا یہ اللہ میاں جانے۔ عیش کر رہی ہوں اور شروع سے ہی عیش کرتی آئی ہوں۔ اس عیش وعشرت سے جو مجھے آزادی ملی اس سے میں مطمئن ہوں۔ اس لئے کہ اسی ماحول میں میں نے لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتی رہی، لکھتی رہی اور بھائیوں اور بہنوں سے لڑتی رہی کیا وہ زمانہ تھا۔ اُف!

میں ادیبوں کو پھر روسی، فرانسیسی ادیبوں کو بے حد ذوق و شوق سے پڑھتی رہی۔ اس طرح ہمارے خیالات میں اور بھی وسعت پیدا ہوئی۔ حالانکہ اس زمانے میں انگریزی ادب کا بول بالا تھا۔ یعنی انگریزی ادب اس زمانہ کے لحاظ سے آج کے کوڑا کرکٹ سے بالکل مختلف تھا۔ اور میرے شعور میں لوچ آئی تو وہ ان کتابوں کے ذریعہ آئی۔ چونکہ

انگریزی ادب اس زمانہ میں ایک خاص اہمیت رکھتا تھا اور اس میں وہ سب کچھ موجود تھا جو ایک باشعور کے لئے ناگزیر ہے۔ میں نے انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور اسی زبان کے ذریعہ میں نے لکھنے کا انداز اور چلبلے پن کو پایا۔ اس وقت کے اردو ادب میں اصلاح کا جذبہ تھا قومی بیداری کے لئے اردو ادب میں بہت کچھ لکھا جا رہا تھا۔ یعنی اس وقت اردو ادب مجموعی طور پر اصلاحی ادب بن چکا تھا۔ اسی زمانے میں اردو کے معروف افسانہ نگار ابھر رہے تھے۔ کیا وہ زمانہ رہا کہ مجھ کو پریم چند کی تخلیق اور ان کی شخصیت نے ضرورت سے زیادہ متاثر کیا۔ ایک بار تو ایسا ہوا کہ پریم چند کو دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا اور ان سے آٹوگراف لینے بھی گئی، لیکن کیا مجال جو ان کو اتنا سا چھوسکوں، مگر کیا کہنے؟ وہ میرے محبوب رائٹر تھے اور صاحب میں نے ان کو ایک انگلی سے چھودیا۔ میں بڑی خوش ہوئی کہ میں نے اتنے بڑے رائٹر کو ایک انگلی سے چھودیا۔ ایک انگلی سے چھونے سے میں رائٹر ہوگئی، اگر پورا ہاتھ ہی رکھ دیتی تو نہ جانے کیا بن جاتی اور نہ جانے کیا ہو جاتی۔ اللہ تعالٰی بھی کیسی کیسی عادتیں دیتا ہے۔ فی الحقیقت یہ عادت ایک بچکانہ ہی تھی، مگر میں بہت خوش ہوئی۔ اور آٹوگراف لے کر چلی آئی۔ میرے قلم میں جو طاقت آئی وہ پریم چند کے چھونے سے آئی وہ میرے سب سے زیادہ محبوب ادیب تھے۔ مجھے یہ نہیں معلوم ہے کہ ٹیگور نے کیا لکھا ہے اور کیسے لکھا ہے اور ان کی تحریروں میں کون سا جادو ہے نہ جانے کیوں مجھے ان کی تحریروں کو پڑھ کر ہندوستان سے محبت اور اس کی عظمت دل میں پیدا ہوگئی ہے اور یہ کیسے؟ یہ مجھے نہیں معلوم، مگر صاحب ان ادیبوں کو پڑھ کر جو احساس کمتری تھا وہ ضرور ختم ہوگیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ میں جو چاہوں وہ کرسکتی ہوں اور ایسا ہی ہوا کہ میں نے اپنی زندگی آپ جی اور جی رہی ہوں۔ اللہ میاں کا دیا کیا کم رہا ہے اور ہے۔ اللہ نے ہمیں بہت کچھ دیا اور بہت کچھ چھینا بھی ہے، لیکن اس کی ذات سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے بندوں کے لئے کرتا ہے اس لئے اس کے معاملہ میں کسی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ دنیا کو بنانے والا اور بگاڑنے والا ہے وہ جس کو جس طرح کی زندگی دے اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے ہمیں زندگی بھر عیش وعشرت دیا میں اس زندگی سے مطمئن ہوں۔ اس لئے اس نے مجھے خوب ٹھاٹ کرائے میں اس کی شکرگزار ہوں۔ میں نے خود کو ہمیشہ

پہلے ہندوستانی اور پھر کچھ اور سمجھا ہے اور کسی بھی ملک کی عزت اور دولت اس احساس سے بڑھ کر نہیں ہے میں ابھی ابھی پاکستان گئی تھی۔تو اخبار والوں کو میں نے بتایا کہ بھئی میں عورت بعد میں ہوں پہلے ہندوستانی ہوں۔انھوں نے حیرت سے دیکھا، میں نے کہا اس میں کیا شک ہے، جہاں میں پیدا ہوئی ہوں وہ میرا عزیز ملک ہے اور اس سے میں بہت پیار کرتی ہوں۔دنیا کی کوئی طاقت میرے اپنے ملک سے الگ نہیں کر سکتی ہے۔ میں ہندوستانی ہوں اور آخری دم تک ہندوستانی رہوں گی۔

اشرف : مذاہب اور عقاید کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

عصمت چغتائی : میں نے تمام مذاہب کا مطالعہ کیا ہے اور سبھی کو بہت خوبصورت پایا ہے اور سب پر یقین کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔میرا سبھی مذہبوں پر وشواس ہے، یقین ہے اور ایمان ہے۔ مجھے ہندوستان میں پیدا ہونے کا فخر ہے اور ہندوستانی ہونے کا جذبہ میرے دل و دماغ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ میں نے قرآن کا مطالعہ وہ بھی ترجمہ کے ساتھ کیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ مولوی کی طرح حافظ کرلیں کم سے کم اس کا مطلب بھی سمجھئے اس میں کیا لکھا ہے؟ کیا ضروری ہے کہ عربی میں اچھی باتیں ہی لکھی ہوں گی ارے بھئی ان کو یہ نہیں معلوم کہ عربی میں گالی بھی ہوتی ہے۔کیا اسے بھی حفظ کرلیں۔میں ان مذہب کے چاپلوسوں سے تو عاجز ہوں مسلمانوں کو جدھر چاہتے ہیں لے جاتے ہیں اور مسلمان ان مذہبی چاپلوسوں کی چال سے ناواقف رہتا ہے۔ جو یہ کہتے ہیں مسلمان وہی کرتا ہے۔ارے نکمو! جب تک قرآن کا مطالعہ ترجمہ کے ساتھ نہ ہو بے کار ہے۔اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ قرآن کا مطالعہ ترجمہ کے ساتھ کریں۔اس مطالعہ سے قرآن میں جو کچھ خدا نے فرمایا ہے اس کے مطلب کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔آج قرآن کی صحیح تعلیم مسلم معاشرہ میں نہ ہونے سے مسلمانوں میں جہالت، غربت اور فرسودہ خیالات کو فروغ مل رہا ہے۔آج کے مسلمانوں میں مذہبی شعور کا فقدان ہے،ان کے اندر پختگی نہیں ہے وہ آج اپنے مذہبی راستے اور دین کی بتائی ہوئی باتوں سے ہٹ گئے ہیں۔ اس کا ذمہ دار کوئی اور نہیں وہی مذہبی ٹھیکیدار ہیں جو مذہب کی دلالی کرتے پھر رہے ہیں۔ چند سکوں کی لالچ میں انھوں نے مذہب کو بیچ ڈالا ہے۔ایسے دلالوں کا جو مذہب کا آڑ لے

کر سماج میں غلط کام کرنے میں ملوث ہیں، ان کا نہ دین اچھا ہے نہ دنیا۔ خدا ان کو جہنم میں جگہ دے گا۔

میں نے قرآن کے ساتھ ساتھ گیتا بھی پڑھی۔ دونوں سے مجھے گیان ملا ہے۔ اس لئے میرا عقیدہ ہر ایک مذہب کے لئے برابر ہے۔ چونکہ قرآن اور گیتا میں وہی لکھا ہے جو بائبل اور انجیل میں ہے۔ بھی کتابوں میں خدا کو ایک مانا ہے اور ہر مذہب نے اس کی طاقت کو سپریم طاقت سمجھا ہے۔ اس لئے میرا ایمان بھی مذاہب پر یکساں ہے۔ مجھے ذرے ذرے میں خدا کا نور دکھائی دیتا ہے۔ اس کا جلوہ پتھر میں بھی ہے اور پہاڑوں میں بھی، دریاؤں میں بھی ہے۔ یعنی خدا کا نور ہر شے میں ہے اور ہر ذرے ذرے میں نظر آتا ہے۔ اس کے حکم کے بغیر دنیا کا سارا انظام درہم برہم ہے۔ اس نے اپنے بندوں کو اس لئے بھیجا کہ ان میں ایک دوسرے کی محبت جاگے، دنیا کے تمام عیش اپنے بندوں کے لئے وقف کیا ہے۔ تاکہ ہمارے بندے دنیاوی عیش وعشرت سے فیض یاب ہوں اور انسانیت کو سمجھیں اور ہمارے کارناموں کو سراہیں، لیکن آج کا انسان اس کے کارناموں پر انگلی اٹھا رہا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے چاند ستاروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ہے۔ خاص طور پر سائنس داں اس کے کارناموں کا مذاق اڑا رہا ہے۔ اس کے جلوؤں سے اور اس کے کرشموں سے انکار کر رہا ہے۔ یعنی جس خدا نے اس حقیر بندے کو دنیا میں اپنا نور دے کر بھیجا آج وہی اس کا دشمن ہو گیا ہے۔ میرے یقین کی بنیاد بودھ ازم اور جین ازم سے شروع ہوتی ہے اور میں دیوی دیوتاؤں میں ایک ہی خدا کا نور دیکھتی ہوں۔ یہی سبب ہے کہ میں ہر ایک مذہب کو ایک مانتی ہوں اور بھی پر میرا یقین اور ایمان ہے اور رہے گا۔

ایک بار جوش ملیح آبادی بمبئی آئے اور ہوٹل تاج میں قیام کیا اور مجھے کسی طرح اطلاع ملی تو میں ان سے ملنے گئی۔ وہ ایک میز پر کھانا کھا رہے تھے اور میں ان کے پیچھے بیٹھی رہی۔ چونکہ کھانا کھانے کے وقت میں پہنچی تھی اس لئے مجبوراً کھانا بھی کھانا پڑا، لیکن جب جوش صاحب کھا چکے تو بیرا ہاتھ دھلانے آیا تو اسے ہٹا کر میں نے ان کو ہاتھ دھلایا، جب ان کی نظر مجھ پر پڑی تو بے چارے چونکے اور بولے ''تم سے میں ہاتھ نہیں دھلاؤں گا۔'' میں نے کہا دھلانا پڑے گا چونکہ اس کے علاوہ ہاتھ دھونے کی کوئی اور جگہ نہیں ہے۔ مجبوراً

انھیں ہاتھ دھونا پڑا۔ کمرے میں بیٹھی تھی۔ ان کی بیاض اٹھا کر پڑھنے لگی، دیکھ کر بہت ناراض ہوئے۔ جوشؔ کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں دریں اثنا ایک خوبصورت لڑکی جوشؔ صاحب کے سامنے سے گزری، انھوں نے اس لڑکی کے حسن و جمال کی بڑی تعریف کی لیکن اس تعریف کو لڑکی کی ماں نے اچھا نہیں سمجھا اور جوشؔ صاحب کو برا بھلا کہنے لگی۔ جب باہر میں آئی تو اس لڑکی کی ماں کو میں نے زور سے ڈانٹا اور کہا کہ پگلی وہ بے چارے بوڑھے آدمی ہیں، تمہاری لڑکی کو نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ ان کی آنکھیں ہی ایسی ہیں۔ لڑکی کی ماں نے کہا بہت ٹیڑھا تاک رہا تھا۔ نہیں نہیں "اری وہ تو تیری لڑکی میں خدا کا نور اور اس کا جلوہ دیکھ رہے تھے" تیری لڑکی کو خراب نظروں سے نہیں دیکھا۔

میں نے اپنی من مانی کی۔ جو چاہا کیا، لیکن کسی سے میرا رشتہ نہیں ختم ہوا۔ میرے گرو میرے بھائی عظیم بیگ چغتائی تھے۔ انھوں نے اپنی اولاد سے زیادہ میری تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دی۔ میرے خیالات کو انھوں نے روشنی بخشی، لیکن اس کے برعکس میں نے ان کو کچھ نہیں دیا۔ اُف رے! عظیم بھائی۔ کیا تھے تم؟ آج بھی میری بھابی یعنی بیگم عظیم بیگ سے گہری دوستی ہے اور زبردست ان سے محبت کرتی ہوں۔ ان کے بچوں سے اور ان سے دور کے رشتہ داروں سے بھی بہت پیار کرتی ہوں۔ بھابی جان گو کہ پڑھی لکھی نہیں ہیں یہاں تک کہ وہ اپنا نام بھی لکھنا نہیں جانتی تھیں، لیکن بڑی کوشش کے بعد وہ مشکل سے اپنا نام لکھنا سیکھ گئی تھیں۔ عظیم بیگ بھائی کی تو یہ حالت تھی کہ مجھے کیا کچھ نہیں سمجھتے تھے، لیکن میں آج بھی ان کے نام کو یاد کر کے افسوس کرتی ہوں۔ کیا تھے عظیم بھائی! کیا دن تھے؟ کیسے لوگ تھے، سب چلے گئے، کوئی نہیں رہا، میں نے اپنی زندگی کا انمول سونا کھو دیا۔

اشرف : آپ نے تو کئی بیرونی ممالک کی سیر بھی کی ہے۔ ان کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

عصمت چغتائی : میں نے چین، روس، چیکسلوا کیہ، انگلینڈ اور فن لینڈ کی یاترا کی، بہت اچھے اچھے لوگ ملے۔ میرا اپنا یقین ہے کہ ازل سے انسان اشتراکیت کا عادی رہا ہے اور ایک دن دنیا میں مل بانٹ کر ہی سکون سے رہا جا سکے گا۔

اشرف : آپ نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ بعض تعلیمی اداروں کی ملازمت میں گزارا تھا، ان

ملازمتوں کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

عصمت چغتائی : میں نے کوئی آٹھ مہینہ ملازمت جاورہ میں کی۔ جہاں میرے بھائی عظیم بیگ چغتائی جج تھے۔ پھر بریلی میں ایک سال نوکری کی پھر ٹریننگ کے لئے علی گڑھ آئی۔ وہاں ٹیچر ٹریننگ کا انتظام نہیں تھا، اور جھگڑا کر کے وہاں بی۔ ٹی کلاس کا انتظام کرایا۔ اس وقت یونیورسٹی کے وائس چانسلر قریشی صاحب تھے اور اس کے علاوہ ٹریننگ کالج کے پرنسپل حبیب الرحمٰن صاحب تھے۔ ان دونوں کی مدد سے ٹریننگ کلاس لڑکیوں کے لئے شروع کرائی۔ ٹریننگ پوری کرنے کے بعد پھر نوکری کی، تقریباً دو سال مہیلا کالج جودھ پور میں نوکری کرنے کے بعد بمبئی آ گئی جہاں پھر مجھے نوکری مل گئی اور یہیں سے میری نوکری کا سلسلہ ختم ہوتا ہے یعنی میں ریٹائر کر گئی۔

اشرف : اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں آپ کچھ تفصیلات بہم پہنچا سکتی ہیں؟

عصمت چغتائی : شاہد صاحب سے میری شادی ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔ شادی کے بعد جو حالات میرے سامنے آئے اُف! مت پوچھو کیا ہوا میاں؟ شادی کے پہلے دن تو بالکل خاموش تھے اور اس دن ذرا گھر پر مہمان آئے تھے۔ اس لئے اس دن کچھ بھی نہ ہوا مگر صاحب دوسرے دن جو لڑائی شروع ہوئی، جو دھینگا مشتی ہوئی تو آخری وقت تک بند نہ ہوئی۔ ارے جناب خوب لڑائی جھگڑے۔ کیا دن وہ بھی تھے؟ میں جو کبھی جھگڑوں سے گھبرائی نہیں اس لئے کہ بچپن سے ہی بھائیوں اور بہنوں سے لڑائی جھگڑے کرتی آئی تھی، اس لئے میں لڑائی جھگڑوں کی عادی ہو گئی تھی۔ روز جھگڑے ہوتے اور روز ملتے۔ اس کی وجہ صاف تھی شوہر صاحب جو چاہتے تھے، میں نہیں ہونے دیتی چونکہ میں شروع سے ہی اپنی من مانی کرتی آئی تھی اور ضدی طبیعت میری گھٹی میں پڑی تھی۔ میں کیسے شوہر جناب کو خاطر میں لاتی۔ اس کے بعد میں ترقی پسند گروہ میں شامل ہو گئی۔ قلم چلتا رہا اور اس وقت بھی چلتا ہے۔ اسی درمیان میں اسکول انسپکٹریس ہو گئی اور قلم میں اور زیادہ طاقت آ گئی اور اس طرح خوب لکھنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اس کے علاوہ فلموں کے لئے بھی لکھتی رہی۔ شاہد صاحب چونکہ فلم ڈائریکٹر تھے اس لئے ان کی بنائی ہوئی فلموں کے لئے مکالمے اور کہانی لکھا کرتی لیکن جو فلمیں میں نے لکھیں وہ کبھی دیکھی نہیں۔ آفس سے فرصت ملتی تو گھر پر بیٹھ کر شاہد صاحب کے علاوہ دیگر فلموں

کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کے لئے بھی لکھا کرتی۔ شاہد صاحب اور میں ہمیشہ لڑا کرتے تھے مگر رشتہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اشرف : آپ نے فلموں کا ذکر کیا تو ان کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

عصمت چغتائی : ہاں اس کے بعد میں نے بھی فلمیں بنائیں، مگر اس کا انجام کیا ہوا کہ آج تک ان فلموں کے کوئی ریکارڈس محفوظ نہیں ہیں، کیونکہ سارے کاغذات کو دیمک چاٹ گئی اور میری جو فلمیں تھیں وہ یہ ہے فریب۔ دروازہ۔ سونے کی چڑیا۔ لالہ رخ۔ سوسائٹی اور آرزو۔ یہ سب فلمیں بری طرح فلاپ ہوئیں۔ اور سارا پیسہ ڈوب گیا۔ شاہد کے بعد امر کمار کی فلم کے لئے مکالمے لکھتی رہی اور اس کے بعد گرودت کی فلموں کے لئے بھی تھوڑا بہت کام کیا۔ پھر جاں نثار اختر کی فلم بنی اس میں بھی میں نے لکھا اور ساحر لدھیانوی نے تھوڑا پیسہ دلوا دیا۔ ''گرم ہوا'' فلم کا تو پیسہ نہیں ملا لیکن فلم کی کہانی۔ جو میں نے لکھی تھی اس پر ایوارڈ ملا جو دس ہزار کا تھا چونکہ کیفی اعظمی نے اس فلم کے مکالمے لکھے تھے۔ اس لئے ایوارڈ کا پیسہ ہم دونوں نے آدھا آدھا بانٹ لیا۔ اور اس کے بعد کسی فلم میں میں نے کچھ نہیں لکھا۔ میری اپنی پانچ فلموں کا دیوالہ ہو گیا۔ اس لئے میں نے فلمیں بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

ادھر شاہد کو شراب پینے کی عادت پڑ گئی۔ وہ شراب کے بغیر نہیں رہ پاتے تھے۔ ایک دن اس شراب نے انھیں موت کے گھاٹ تک پہنچا دیا، اور آخر کار ۱۹۶۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا یعنی ان کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ شاہد اپنے کو شوہر کی اہمیت بتاتے اور جتاتے اور میں ان کو گھاس تک نہیں ڈالتی تھی۔ جب میں نے بھائیوں اور بہنوں یہاں تک کہ ماں باپ کو نہیں بخشا تو ان کو میں کہاں چھوڑتی۔ میں آزاد خیال رہی ہوں، کبھی کسی کا رعب نہ سہا۔ شادی وادی کیا چیز ہے، شادی اپنی جگہ ہے اور میری آزادی اپنی جگہ۔ شادی بس یوں ہی ہوئی یا ہو گئی۔ جیسی زندگی پہلے تھی آج بھی ہے۔ شادی وادی سے کوئی فرق ہماری زندگی میں نہیں آیا۔ اور نہ ہی اس کا کوئی احساس میں نے کیا۔ ہاں میرا دل و دماغ بہت صاف ہے۔ میں کسی سے عداوت نہیں رکھتی۔ ذہنی طور پر میں بالکل صاف رہی ہوں۔ میں نے آج تک کسی سے اپنے کو الگ نہیں سمجھا، ہر ایک کو میں نے اپنا دوست اور عزیز سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کسی سے کوئی دھوکہ نہیں کھایا۔ ہر ایک کے ساتھ میرا برتاؤ یکساں رہا، میں نے

کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا۔آج میں بہت خوش ہوں اور خدا نے چاہا تو مستقبل میں بھی خوش رہوں گی۔ مجھے کپڑوں کا کوئی شوق نہیں۔عام طور پر جیسا کہ عورتوں میں اچھے سے اچھا کپڑوں کا شوق ہوتا ہے۔زیورات اور پاؤڈر کریم ان کی فطرت میں شامل ہے۔ان سب سے مجھے کوفت ہوتی ہے۔میں نے اپنا حق چھوڑ بھی دیا،لیکن دوسرے کا حق کبھی نہیں چھینا۔چونکہ اسی قلم نے بہت سے رشتہ دار اور ناتے دار پیدا کئے اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے زندگی میں کبھی تنہائی محسوس نہیں کی قلم کا اور خون کا رشتہ غالباً یکساں ہے چونکہ دونوں کو میں نے قلم سے ہی حاصل کیا۔میرا سب سے بڑا دشمن اور دوست قلم ہی ہے۔ قلم نے کبھی مجھے دل سے دکھ نہیں پہنچایا۔دل اتنا صاف ہے کہ شاہد کے رشتہ داروں سے بہت اچھی بنتی رہی مگر شاہد سے کبھی نہیں بنی۔میرے اپنے بھتیجوں اور بھانجوں میں اور شاہد کے بھانجوں اور بھانجیوں میں خوب بنی اور ایک دوسرے کا برتاؤ بہت اچھا رہا۔

جب میں نے اپنے بھائی کے اوپر ''دوزخی'' نام سے مضمون لکھا تو بغیر پڑھے ان کے بچے جن سے مجھے زیادہ محبت رہی اور ایک یہ بھی اتفاق رہا۔مجھ سے ہمیشہ کے لئے خفا ہو گئے اور وہ مضمون انھوں نے نہیں پڑھا،اور برابر یہ کہتے رہے کہ میرے باپ کے نام کے ساتھ ''دوزخی'' لگایا ہے۔جب یہ مضمون لکھا تھا تو ''دوزخی'' کا عنوان اس لئے رکھا تھا کہ میرے بڑے ماموں نے ان کو کہا تھا کہ عظیم بیگ تم دوزخ میں جاؤ گے،اس لئے کہ تم اپنے سرہانے قرآن رکھتے ہو،اس کی بے ادبی ہوتی ہے'' اس وقت عظیم بیگ کی ٹانگیں مفلوج تھیں۔وہ ہر وقت قرآن اور حدیث سرہانے ہی رکھتے تھے اور چپ چاپ پڑھا کرتے تھے اور جب کوئی مسئلہ پوچھتا تو یا کوئی ایسی گفتگو ہوتی تو فوراً اندر جاتے اور دیکھ کر آتے اور فوراً مسئلہ دکھاتے اور سبھی کو قائل کر دیتے تھے۔قرآن کی مدد سے وہ عورت کو جائز حق دلانے کی عمر بھر کوشش کرتے رہے۔جب کوئی مسئلہ عورت کے متعلق ہوتا تو فوراً وہ سرہانے سے قرآن اور حدیث اٹھا کر دکھاتے اور لوگ ان کی اس دلیل سے قائل ہو جاتے تھے۔ہمارے بڑے ماموں نے انھیں ''دوزخی'' کہا تھا اور میرا بھی یقین ہے کہ جو انسان عظیم بھائی کی طرح حساس اور ذی شعور ہو اس کے لئے دنیا دوزخ بن جاتی ہے۔ان کے بہت مخالفین تھے۔ کاش مجھے بھی ان کے صدقے میں یہ ''دوزخی'' کا خطاب مل سکے۔

شادی کے بعد مجھے شاہد نے دوسرے دن ہی کہا کہ اب تم لکھنا چھوڑ دو "لحاف" پر مقدمہ چل گیا تھا۔ اور اسے وہ بدنامی کی بات سمجھتے تھے۔ کیونکہ اخباروں میں مجھے سخت ملامتیں مل رہی تھیں۔ حالانکہ یہ مقدمہ ہم جیت گئے۔ نہ کوئی سزا اور نہ کوئی جرمانہ پھر بھی شاہد نے کہا کہ "بھئی تم لکھنا چھوڑ دو" فلموں کے لئے لکھو دیسے تو فلموں سے آمدنی ہوتی رہتی ہے پھر کیوں لکھتی ہو۔" میں نے ان سے کہا کہ کل تم کہو گے کہ سانس لینا چھوڑ دو۔ میری پہلی شادی قلم سے ہی ہوئی۔ جھگڑا ہوتا ہی رہا اور قلم چلتا رہا اور شاہد میری کہانیوں کا سودا کیا کرتے۔ مجھے کہانی لکھنی آتی تھی مگر اس کہانی کو بیچنا نہیں آتا تھا۔

اشرف : آل اولاد؟

عصمت چغتائی : میری دو لڑکیاں ہیں ایک نے اپنی مرضی سے شادی کر لی۔ اس شادی میں میری کوئی مرضی شامل نہیں تھی۔ لڑکی کی شادی میں میں شریک ہوئی اس نے مجھے ہوائی جہاز کا واپسی ٹکٹ بھی بھیجا تھا۔ بہرحال جب اس لڑکی کی شادی ہوگئی تو مجھ سے ایک دن اس نے پوچھا کہ "امی میری ساس مجھے آریہ سماجی ہونے کو کہہ رہی ہیں، بتایئے آپ کی کیا مرضی ہے؟" میں نے کہا تیرا مذہب کیا ہے؟ اس نے کہا اسلام اور تیرے ماں باپ؟ مسلمان ہیں کہا "ہاں" "تو پھر کیوں تو آریہ سماجی ہونا پسند کرتی ہے" لڑکی نے جواب دیا "اصل میں امی وہ بہت سارے زیورات دے رہی ہیں" "اچھا تو یہ بات ہے، تو ہو جا آریہ سماجی، مگر سن تو اپنی ساس کے پاس مجھے لے چل میں بھی آریہ سماجی ہونا چاہتی ہوں مجھے اس پندرہ ہزار روپے دلوا دینا تا کہ گھر کا خرچ آرام سے چلے۔ لڑکی کی ساس نے سنا گھر پر آ کر معافی مانگی اور کہا کہ بہن میں نے آپ کو کچھ نہیں کہا تھا اس طرح پہلی لڑکی آریہ سماج ہوئی۔ چند دنوں کے بعد شوہر سے اس کا جھگڑا ہوا وہ میرے پاس آ گئی۔ اور ساتھ میں ایک لڑکا بھی لے آئی جس کا نام آشیش ہے یعنی وہ میرا نواسہ ہے۔ میں اس سے بہت پیار کرتی ہوں۔ دونوں لڑکیاں کماتی ہیں اور اچھا کماتی ہیں۔ گھر کا سارا خرچ وہی سنبھالتی ہیں۔ میں اب بھی اپنے حصہ کا کچھ نہ کچھ نکال لیتی ہوں۔

اشرف : آپ نے فلمی دنیا میں کب اور کیوں شمولیت اختیار کی؟

عصمت چغتائی : شاہد صاحب نے بامبے ٹاکیز کے s I D o کے ڈائیلاگ لکھے۔

شاید دو تین فلمیں ہوں گی ان کا نام تو یاد نہیں ہے، اس وقت بھول رہی ہوں اور اس کے بعد کے آصف اور نور محمد چارلی میرے گھر آئے اور کہا کہ مجھے ایک کہانی چاہئے اور جلدی چاہئے۔ میں نے سوچا اور کہا اچھا ٹھیک ہے کہانی آپ کو مل جائے گی۔ میں نے ان کو دو ایک کہانی کا آئڈیا سنایا۔ ایک کہانی ان کو پسند آ گئی وہ یوں ہے کہ ایک لڑکی ہے اس کی شادی کسی لڑکے سے طے ہو جاتی ہے اور لڑکی شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جس لڑکے کو میں نے نہیں دیکھا اس سے میں شادی نہیں کر سکتی، ماں باپ نے کہا کہ شادی ہم لوگ طے کرتے ہیں بھلا اس میں لڑکی کی مرضی کی کیا ضرورت ہے اور یہ بھی کہ لڑکی لڑکے کو دیکھ لے تب شادی ہو یہ کس سماج کا قانون ہے۔ لڑکی اس طرح اپنے والدین سے ناراض ہو کر گھر چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے...... پھر اس کی ملاقات ایک نوجوان سے ہوتی ہے لڑکی وہاں صرف پڑھنے اور پڑھانے کے سوا اور کچھ نہیں کرتی۔ مگر اتفاق سے اس لڑکے سے ملاقات ہوتی ہے اور اس کا عشق اسی سے ہو جاتا ہے۔ لڑکی بھی کام کرتی ہے اور لڑکا بھی کماتا ہے۔ یہ وہی لڑکا ہے جس سے اس کے ماں باپ نے اس کی شادی طے کی تھی اور لڑکی نے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس فلم کا نام ''چھیڑ چھاڑ'' تھا۔ اپنے کو کیا تھا، یہ آئیڈیا ان کو پسند آیا اور فلم بن گئی۔

فلموں کے علاوہ جو میرا خاص مشغلہ تھا وہ میری نوکری تھی۔ بامبے آنے پر ساڑھے تین سو روپے کی نوکری میں نے کی جو اس زمانہ میں بہت تھا۔ میں تو اسکول انسپکٹریس تھی لیکن بعد میں اردو سپرنٹنڈنٹ کا بھی چارج میں نے سنبھالا جس سے میری ذمہ داری تھوڑی بڑھ گئی، مگر اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ حاضری بنا دیتی پھر آرام ہی آرام تھا۔ میں جس کو جہاں چاہتی، تبادلہ کر دیتی۔ مگر بھئی حاضری کے علاوہ میں کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ ایک بار میرا رجسٹر سکریٹری صاحبہ نے چپکے سے منگا کر دیکھا اور کہا کہ تم کہاں غائب رہتی ہو۔ میں فٹافٹ جواب دیتی چلی جاتی۔ ظاہر ہے کہ میں کسی کو آج تک خاطر میں نہیں لائی تو یہ سکریٹری صاحبہ کیا چیز تھیں؟ دراصل میری خاص مصروفیات اس زمانہ میں یہ تھی کہ میں اس وقت ''ٹیڑھی لکیر'' لکھ رہی تھی کسے اتنی فرصت ہے، کون کس کی حاضری چیک کرے آفس میں بیٹھ کر صرف لکھنا اور کوئی کام نہیں۔ سکریٹری نے پوچھا کیا لکھ رہی ہو؟ میں نے جواب دیا بس ایک ناول ہے۔ اچھا۔ اچھا۔ اور ادھر فلموں کا کام زیادہ ہو گیا تھا۔ بس شاید

صاحب اور میں کہانی اور ڈائیلاگ لکھتے اور فلم بناتے۔ شاہد صاحب کو ایک اور جگہ کام مل گیا تھا جس کی وجہ سے باہے ٹا کیز چھوڑنا پڑا۔ شاہد ہمیشہ کہانی کا آئیڈیا دیتے تو میں کہتی کہ کہو تو میں ڈائیلاگ لکھ دوں اور اس پر وہ راضی ہو جاتے اور میں دو تین دن میں فلم کے ڈائیلاگ لکھ ڈالتی۔ اور فوراً اس کا پیسہ وصول کرتی۔ وہ حیرت میں پڑ جاتے تھے اور پاکٹ سے فوراً تین ہزار روپے نقد میرے ہاتھوں میں دیتے اور یہی سلسلہ چلتا رہا اور شاہد کو اور بھی فلموں کے کام ملتے گئے۔ اور میں نے بغیر پیسہ لئے نہ ڈائیلاگ لکھا اور نہ کہانی کا کوئی آئیڈیا دیا۔

اشرف: خدا کا شکر ہے کہ آپ کو دنیا کا وسیع تجربہ حاصل ہے۔ اس تجربے کا لب لباب کیا ہے؟

عصمت چغتائی: سب سے زیادہ ناپسند جھوٹ ہے میں زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولی اور کسی کو جھوٹ بولتے دیکھ کر میں خوش نہیں ہوتی ہوں۔ اس لئے کہ جھوٹ سے مجھے نفرت ہے اور میں سچ بولنے پر ہی بچپن میں بیمار پڑی، خوبصورت چیزیں پسند ہیں اور ہر مذہب کی عزت میرے دل میں ہے۔ میں کسی مذہب کو خراب نہیں سمجھتی۔ ہر ملک و قوم کے فنکار، فلاسفر سب میرے اپنے پسندیدہ ہیں۔ سب مذاہب کا نچوڑ میرا مذہب ''اسلام'' ہے۔ میرا ضمیر بڑا صاف ہے۔ اور بڑا مطمئن ہے۔ جب مجھے عقل اور سمجھ آئی تو سب سے پہلے جو اپنایا وہی میرا مذہب ہے اور اس کے علاوہ سب کچھ وہی ہے جو نور الٰہی ہے۔ بس اس کے رسول ہیں اور میں ان کی خادمہ ہوں۔

جو میں نے چاہا، اسے اپنایا، جس اصول کو چاہا اسے اپنایا جس اصول کو چاہا، توڑ دیا۔ زندگی کی راہوں میں جو کچھ حائل تھا اسے اپنی مرضی کے مطابق توڑ دیا، اور کسی کی پابند نہ رہی اور کسی کا کوئی حق میں نے نہیں چھینا اور کسی سے کوئی خفگی نہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے جیسا چاہا اس سے کہیں زیادہ بہتر بننے کی کوشش کرتی رہی، دوست زندگی میں بہت آئے مگر ان کے ساتھ وہی برتاؤ رہا جو ایک انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسانیت سے مجھے ہمیشہ پیار رہا۔ میں کبھی کسی کو خفا ہوتے نہیں دیکھ سکتی چونکہ میرا دل اور ضمیر بہت صاف ہے۔ فلمی دنیا میں اور غیر فلمی دنیا میں ہر جگہ میرا رویہ یکساں رہا۔ لوگوں نے میرا پیسہ مار لیا مگر میں نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ میری ذات سے کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ جہاں تک میرا خیال ہے تو

دشمن سے بھی وہی برتاؤ میرا تھا جو ایک دوست سے ہوتا تھا۔

میں نے زندگی میں کوئی خواب نہیں دیکھا۔ ساری چیزیں اور ساری مشکلات اپنے آپ اور خود بخود حل ہوتی رہیں۔ مجھے خواب کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس لئے پوری زندگی آسان رہی اور آج بھی آسان ہے۔ دولت کی کوئی کمی نہیں ہے، خوب دولت ہے۔ پاکستان جب میں گئی تو لوگوں نے مجھے گیارہ ہزار روپے دیے تھے۔ میں نے سارے روپے وہیں غریبوں کو بانٹ دیے اور کپڑے جو ملے وہ بھی وہیں بھائی اور ان کے رشتہ داروں کو ہی دے دیے۔ ہاں دو چار کتابیں تھیں، وہ میرے ساتھ آ گئیں۔

زندگی میں جو خواب تھے وہ میرا قلم تھا جسے آج بھی چلتا پھرتا پاتا ہوں، میں اس کے بھروسے آج بھی زندہ ہوں۔ میں نے جو دیکھا ہمیشہ پایا۔ مجھے زندگی بھر پیسوں کی ضرورت نہیں رہی۔ میری دلی خواہش ہے کہ لوگ میری کتابیں پڑھتے رہیں۔ اس میں جو خوشی ملتی ہے وہ روپیوں اور پیسوں میں نہیں ہے۔ آج میں جہاں جاتی ہوں، وہاں لاکھوں کی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی ہے۔ لوگ مجھے دیکھنے کے لئے آتے ہیں اور اپنے چاہنے والوں کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوتی ہوں۔ اس سے بڑا اور کیا خواب ہوگا؟ میری زندگی بھر کی دولت کسی کام کی نہیں ہے اگر یہ دولت ہے تو سمجھو سب بے کار ہے اور یہ خواب تو نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جو میرے دل کو تسلی دیتا ہے اور میں جب تک دنیا میں ہوں یہ سلسلہ چلتا رہے گا اور یہ خواب میری زندگی میں پورے تو نہ ہوں گے بلکہ میری زندگی کے ساتھ ہی مکمل ہوں گے۔ ابھی تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

اشرف : آپ کن شاعروں اور ادیبوں سے زیادہ متاثر ہوئیں؟

عصمت چغتائی : بڑے بڑے فلاسفر اور عظیم ادیبوں سے میں نے ملاقات کی اور ان ادیبوں اور فلاسفروں کو خوب پڑھا۔ خاص طور پر اپنے ملک کے ٹیگور، پریم چند اور تمام شعراء کو تو بہت قریب سے ان کی تخلیقات کو پڑھا اور محسوس کیا ہے، لیکن میرے پسندیدہ اور عظیم شاعر کبیر داس ہیں، ان کے فلسفۂ زندگی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ ان کی شاعری نے انسان دوستی کا درس دیا ہے اور اس کے علاوہ جو سب سے زیادہ چھوڑ بابل کا گھر...... کے شاعر امیر خسرو نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ ان کی ہندی اور فارسی کی ملی جلی شاعری نے تو

اور بھی مجھے متاثر کیا۔ ان کی شاعری نے محبت اور رواداری کا پیغام دیا ہے اور میں نے انھیں محبت اور رواداری کا پیغمبر مانا ہے۔ مجھے اپنے دیش کے دیوی دیوتاؤں پر بڑا یقین ہے۔

سب سے بڑی دیوی لکشمی جی ہیں جو دولت کی دیوی ہیں اور ان کے علاوہ سرسوتی جی ہیں جو آرٹ، میوزک اور دیگر فنونِ لطیفہ کی دیوی مانی جاتی ہیں۔ انھیں میں چنڈی مانتی ہوں جو دنیا کے ظالم اور ذلیل انسانوں کا ناش کرتی ہیں۔ عظیم انسانوں کے دماغ نے انھیں جنم دیا۔ کرشن جی سب سے پروگریسیو دیوتا تھے۔ انھوں نے عورت کو زندہ رہنے کا اختیار ثابت کیا۔ اسلام مذہب جو سب سے بعد میں آنے کی وجہ سے سب سے زیادہ بلند ہے۔ اس مذہب میں تمام مذاہب کی خوبیاں سمیٹ دی گئی ہیں۔ میں اکثر قرآن کا معنی پڑھتی ہوں اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش کرتی ہوں۔ مجھے درگاہوں اور مندروں میں بڑا سکون ملتا ہے۔ کچھ تو ضرور ہے جن کے کارنامے دنیا میں مشہور ہیں اور ان کی پوجا کی جاتی ہے اور ان کی مزاروں کو احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے ضرور کچھ ایسا کیا ہے جو انسانیت کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کی پوجا ہوتی ہے۔ دراصل انسانیت ہی لوگوں کو بلند کرتی ہے۔

کرشن جی اور ان کے مکان کی چہار دیواری یہاں تک کہ ان کے گاؤں بھی تو ایک ہی درس دیتے ہیں۔ کرشن جی جیسا پروگریسیو مین یعنی پیغمبر جنھوں نے عورت کے حقوق کے لئے بہت کچھ کیا۔ ایک بار کرشن جی پیڑ پر چڑھ گئے اور گوپیاں نہا رہی تھیں۔ ان گوپیوں کے کپڑے بھی کرشن جی اپنے ساتھ اوپر لے گئے۔ انھوں نے گوپیوں سے کہا جن کو کپڑے چاہئے وہ باہر نکل کر آئے اور اپنا کپڑا پیڑ سے اتار لے۔ گوپیاں کہتی ہیں کہ مجھے شرم آتی ہے۔ کرشن جی بولے تو پھر میں کپڑے نہیں دوں گا۔ ارے بھئی کیسی شرم؟ اللہ نے جو چیزیں تمہیں دی ہیں اسے کیوں چھپاتی ہو اس کا کیا پردہ ہے؟ اور اس طرح گوپیاں باری باری آئیں اور اپنا اپنا کپڑا پیڑ سے اتار لے گئیں۔ تو میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کرشن جی عورتوں کے دل سے شرم اور لاج کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ کرشن جی کی یہ ادا مجھے بہت اچھی لگی۔ عورتوں کے جائز حقوق سماج میں کیا ہیں؟ اس کے لئے بھی کرشن جی نے جدوجہد کی اور ہمیشہ انھوں نے عورتوں کو سماج میں مرد کے برابر جینے کا حق دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں

انھیں بہت مانتی ہوں۔

اشرف : سیاست سے آپ نے براہِ راست کوئی رشتہ نہیں رکھا، پھر بھی سیاسی نظریات کا آپ نے مطالعہ کیا ہوگا۔ آپ کس نظریے کو ترجیح دیتی ہیں اور کیوں؟

عصمت چغتائی : کمیونسٹ کے نظریات سے۔ ہر مذہب مساوات اور اشتراک کی حمایت میں اٹھا یہ اور بات ہے کہ طاقت ور، خود غرض لوگوں نے اسے ہتھیار بنایا۔ آج کی حکومت جو دنیا میں ہو رہی ہے یہ بادشاہی حکومت سے مختلف نہیں ہے۔ آج جمہوری نظام کا دنیا میں بول بالا ہے۔ پہلے بادشاہ ایک صدر کی حیثیت سے ہوتا تھا اور وزیر اعظم ایک وزیر کی حیثیت کی تھی۔ مگر جہاں جمہوری نظام قائم ہے وہاں پرائم منسٹر اور پریسیڈنٹ ہوتے ہیں۔ بادشاہی نظام سے کسی طرح مختلف نہیں ہے۔ بادشاہ کا صدر ہونا دنیا کے دوسرے بادشاہوں سے الگ ہے اور پرائم منسٹر جو دوسرے وزیروں کے قبضے میں ہوتا ہے اور پوری حکومت زیادہ تر سرمایہ داروں کے فائدے اور نقصان کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اگر کوئی کام عوام کے لئے یا ان کے فلاح و بہبود کے لئے پرائم منسٹر کرتا ہے تو مصیبت ہو جاتی ہے۔ حالانکہ پرائم منسٹر کا ہر اقدام عوام کے بھلائی کے لئے ہوتا ہے۔ ہماری پرائم منسٹر مسز اندرا گاندھی نے اگر ایمرجنسی لگائی تو کیا برا کیا اس میں عوام کی ہی بھلائی تھی۔ بھئی میرا اس میں کچھ نہیں بگڑا، مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ میں تو کہتی ہوں ایمرجنسی سے عوام کو صرف فائدہ ہی ہوا ہوگا۔ نقصان نہیں۔ دولت مند لوگوں کے لئے ہوسکتا ہے کہ اس سے نقصان پہنچا ہوگا ان کو پریشانی ہوئی ہوگی ہوا کرے میری بلا سے۔ ڈیموکریٹک سسٹم مساوات اور اشتراک زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ چور ڈاکو پیدا ہوتے رہتے ہیں یہ صرف ہندوستان کا سوال نہیں ہے بلکہ پوری دنیا کے لئے ہے۔ کیونکہ پوری دنیا جسے جمہوری دنیا کہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب ساری دنیا میں مساوات اور اشتراک رائج ہوگا اور ازل سے انسان اور ہر مذہب انھیں حقوق کے لئے جدوجہد کرتا رہا ہے یا تو اس ماحول سے خوفزدہ ہو کر طاقت ور سرمایہ دار دنیا کو تباہ کر دے یا جو بڑے بڑے پیغمبر چاہتے تھے وہی ہوگا اور دنیا میں اشتراکیت اور مساوات کا بول بالا ہوگا۔۔۔

میرا علم اتنے بڑے مسئلے کو کیسے حل کر سکتا ہے۔ میرے خیالات کی بنیاد ان ادیبوں،

شاعروں، دانشوروں کو پڑھ کر اور سن کر ہوئی ہے۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ عورت کی تباہی دنیا کی تباہی ہے اور اس کا ذمہ دار مرد ہے۔ جو عورت کے ساتھ بے انصافی کرتا ہے اور پھر عورت کمبخت کیوں پیچھے رہے، وہ بھی تو عیش کرتی ہے۔ بے چارے مرد تو کچھ عورتوں کو دیتے ہی ہیں مگر عورت مردوں کو کیا دیتی ہے؟ صرف جنسی لذت۔ مرد اسی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور پوری زندگی عورتیں راج کرتی ہیں۔ مرد وہ سب کچھ دے دیتا ہے جو عورت کو چاہئے۔ عورت ہی کمبخت ہے، بدذات ہے جو مرد کو بدنام کرتی ہے۔ مرد بے چارے جنسی لذت کی خاطر عورت کی غلامی کرتے پھرتے ہیں اور عورت ایک چھتا پرزہ جو مردوں کو اپنے پیروں کے تلوے چٹواتی ہے۔ جس کے گھروں میں لڑکیاں ہیں تو کیا کہنے بھی کی شادیاں دھوم دھام سے ہوئیں۔ اگر آخری والی کی شادی دھوم دھام سے نہ ہوئی تو فوراً اپنا راستہ الگ کرلے گی۔ یعنی وہ جسم فروشی کا دھندا اختیار کرلیتی ہے۔ اسٹینڈرڈ قسم کا فلیٹ وغیرہ خرید لیا اور کسی سیٹھ کو پھنسالیا اور شادی سے اچھا بزنس ہوتا ہے اور اس بزنس میں ٹھاٹ ہی ٹھاٹ ہوتا ہے۔ پوری زندگی عیش سے گزرتی ہے۔ یعنی گھما پھرا کر مرد الو بن جاتا ہے۔ مرد بلاوجہ بدنام ہے۔ عورت خود مکار ہے وہ اپنے جنسی لذت کی جال میں اس طرح مرد کو پھنساتی ہیں کہ مرد ہمیشہ خالی ہاتھ رہتا ہے اور عورت ہمیشہ اس کی دولت اور جائداد پر عیش کرتی ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب عورت مرد کی غلام ہوتی ہے اور مرد کی محتاج ہوجاتی ہے۔ یوں تو عورت زندگی بھر مردانہ سماج سے اپنے حقوق مانگتی آئی ہے اور مرد نے بھی عورت کے حقوق کے لئے کچھ سوچا ہے۔ ہر دور میں عورت ایک مسئلہ ہے، ساری دنیا کا یہ مسئلہ ہے کیونکہ ہر دور میں مردانہ سماج نے عورت پر ظلم وستم کئے ہیں۔ مرد عورت کو ذلیل کرتا ہے اور خود اس کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں عورت دنیا کی اہم ترین چیز ہے، دنیا کا ایک اہم حصہ ہے۔ عورت سے دنیا کی تخلیق ہوتی ہے اس لئے عورت کی اہمیت دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ اس اہمیت سے جو شخص انکار کرتا ہے وہ عورت کا دشمن ہے۔

میں نے اپنے اردگرد کی عورت کو اپنا فرض ادا کرنے کی ہدایت کی۔ جو اس کی کمزوریاں اور غلطیاں ہیں۔ میں نے اس کی طاقت اور اہمیت کو جاگر کر کے دراصل انھیں بیدار کیا ہے اور انھیں احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔ بقول معترضین کہ ''عورت کو میں

نے بہکایا ہے۔" میں کبھی اس رائے کو درست نہیں سمجھتی۔ لوگ کہتے ہیں تو کہتے رہیں۔ کیا میرا بگڑے گا۔ مجنوں گورکھپوری یا اور بھی تنقید نگار جو مجھ پر لکھ رہے ہیں، لکھتے رہیں میں ان کی کوئی پروا نہیں کرتی۔ ایک بار تو مجنوں صاحب سے ملنے گئی تو وہ ملے ضرور لیکن بات چیت نہیں ہوئی میں نے اپنی ہی بات کہی کہ لوگ شروع شروع میں خوب تعریف لکھتے ہیں اور پھر نہ جانے کیوں برائی لکھنے کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ اس میں لوگوں کو کیا مزہ ملتا ہے، میری بلا سے، مجنوں صاحب خاموش تھے اور نیچے سر کئے سُن رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ کچھ مجھ سے کہیں گے۔ مگر صاحب وہ تو سر نیچے ہی کئے رہے اور ملنے سے انکار کر دیا۔

اشرف : آپ نے ابھی جن خیالات کا اظہار کیا، کیا آپ کی تخلیقات میں انھیں تلاش کیا جا سکتا ہے؟

عصمت چغتائی : میں نے جو لکھا اور کہا وہ حقیقت اور صداقت پر مبنی رہا ہے۔ اس لئے کہ میں ہمیشہ سماج کی سچائیوں کو بے نقاب اور بے پردہ دیکھنا پسند کرتی ہوں۔ سماج میں اس سچائی کو بہت قریب سے میں نے دیکھا ہے، اور اس کا مشاہدہ کیا ہے اور آج بھی کرتی رہی ہوں۔ بمبئی کی غریب بستیوں میں جا کر میں ان حقیقتوں کو تلاش کرتی ہوں، اور ان غریبوں کی زندگی کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کرتی ہوں اور کرداروں کی تخلیق کرتی ہوں۔ میری ہر تخلیق حقیقت نگاری کی آئینہ دار ہے اور میں سماج کی برائیوں کو اس لئے پیش کرتی ہوں تا کہ لوگ اس برائی کو محسوس کریں اور اس کا حل تلاش کریں۔ میرے ہر کردار اسی دنیا کی باتوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

جب میں دس گیارہ برس کی تھی تو ہر ایک شخص کے متعلق اپنی رائے کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھا کرتی تھی۔ جسے جی چاہتا اسے اپنی مرضی سے سزا جزا دیتی تھی مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کسی کو یہ نہیں معلوم کہ میں نے کسے کیا سزا دی۔ کوئی شخص آیا کہ وہ کالا ہے وہ ٹیڑھا ہے وہ کانا ہے وہ لولا ہے یہی سب اپنے کو لکھ کر ہنستی اور خوش ہوتی تھی۔ اور اس کے بعد مجھے پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا مگر انگریزی ادب اور اردو ادب کے بڑے بڑے ادیبوں کو پڑھنے کے بعد مجھ کو بات کہنے کا صحیح انداز ملا۔ "بچپن" جو میں نے اپنے اوپر بیتنے والی اور آس پاس کے بچوں پر گزرنے والی حقیقتوں کو جمع کیا اور سوچ بچار کر ایک رسالہ جو "تہذیب

نسواں" کے نام سے شائع ہوتا تھا اس کو بھیج دیا اور وہ چھپ گیا۔ ۱۹۳۵ء کا زمانہ تھا جس میں میری شروع شروع کہانی منظر عام پر آئی اس کے بعد دوسری کہانی "گیندا" تھی جو "ساقی" دہلی میں شائع ہوئی۔ اس کہانی میں ۱۲۔۱۳ برس کی دھوبن کی لڑکی کے ناجائز بچہ پیدا ہوتا ہے اور اس پر رشک آتا ہے۔ کبھی ایسا ہے کہ میں بچوں سے بہت زیادہ پیار کرتی ہوں، چاہے وہ بچہ کسی ذات کا کیوں نہ ہو۔ ذرا میں لاپرواہ ہوں اس لئے میری بھابی اپنے بچے کبھی مجھے ہرگز نہ دیں۔ وہ ڈرتی تھیں کہ بچہ کو گرا دے گی۔

یہ بات تنقید نگاروں کو بہت ناگوار گزری کہ ایک شریف خاندان کی لڑکی حرام کے بچے پر رشک کرتی ہے نہایت بے شرمی کی بات ہے۔ مجھے اس لڑکی پر رشک آتا کہ وہ معصوم بچے کی طرح کھیل سکتی تھی اور مجھے بھی کھیلنے نہ دیتی اور میری بھابیوں کے بچوں کو قطعی چھونے کی اجازت نہ تھی۔ ایک کہانی "نیرا" ہے جس میں ایک معصوم لڑکی طوائف بنادی جاتی ہے، رنڈی بنادی جاتی ہے۔ جب بھی کوئی نیا گاہک آتا ہے تو اس کی وہ بیوی بنا کرتی ہے اور اس کے ساتھ پھیرے پڑتے دیکھتی ہے محسوس کرتی ہے۔ وہ ہر گاہک کو اپنا شوہر بناتی ہے۔ خود کو یہ گناہ گار بھی سمجھتی ہے، ذہنی طور پر اسے اپنا شوہر بنالیتی ہے۔ اسے اس میں سکون ملتا تھا۔

اشرف: کیا آپ اپنی ادبی زندگی سے مطمئن رہی ہیں؟

عصمت چغتائی: میں نے اپنے قلم کے ذریعہ روٹی روزی کمائی، اسے اپنا ذریعہ رزق بھی بنایا اور تفریح کا سامان بھی۔ قلم کو اپنا سب سے اہم دوست اور رشتہ دار سمجھتی ہوں۔ یہ میری زندگی کی بیش قیمت چیز ہے جسے میں اپنے دل سے لگا کر رکھتی ہوں۔ یہ میری سانس بھی اور موت بھی ہے، میری ہر دھڑکن اس قلم کے ساتھ چلتی ہے اور چلتی رہے گی۔

میرے نانا ایک کتاب "رزم بزم" لکھی تھی جن کا نام امراؤ علی عثمانی تھا۔ ایک طرف حضرت عثمان اور دوسری طرف سے چنگیز خاں۔ ننھیال اور ددھیال ایک تاریخ ہے۔ نانا نے جو کہانی لکھی وہ یوں ہے کہ "ایک سلطان لڑکا اور ایک لڑکی کو پالتا ہے۔ لڑکی اس کی اپنی ہے اور لڑکا اس کے مرحوم دوست کا ہے۔ لیکن ان پر زبردست پابندی ہے کہ وہ کوئی اختلاط نہیں رکھ سکتے ہیں حالانکہ یہ دونوں شادی شدہ ہیں۔ ان دونوں کی دیکھ بھال ایک حبشی کرتا ہے اور ہمیشہ اس کی نظر انہی دونوں پر رہتی ہے۔ شادی کے قبل ان دونوں میں عشق

ہو گیا تھا۔ ایک دن حبشی کو لڑکا قتل کر دیتا ہے اور جنسی اختلاط کی اجازت خود بخود مل جاتی ہے، وہ کیا ہے کہ ان ہی کہانیوں کے ذریعہ مجھ میں تخلیق کی قوت پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے کا زمانہ میری طالب علمی کا ہے۔ جو علی گڑھ کالج میں گزرا جس کالج میں پڑھتی تھی اس کلاس میں عصمت نام کی تین لڑکیاں تھیں۔ عصمت خانم چغتائی دوسرا نام عصمت بانو اور تیسرا نام عصمت بیگم اس طرح کے تین تین نام عصمت کے ساتھ تھے۔ جب کسی کا بھی رشتہ دار یا ملنے والا آئے تو ٹیچر عصمت عصمت کہتیں اور تینوں عصمت ایک ساتھ نکلتیں۔ اس طرح اس چکر سے آزادی اختیار کی اور اپنا نام عصمت چغتائی رکھا ''خانم'' ہٹا دیا۔ وہ نام آج تک چلتا آرہا ہے۔ اسی زمانہ میں ایک پیپر، ایک چیتھڑا نکلتا تھا۔ اس میں اس کالج کی برائی اور طرح طرح کی نکتہ چینی ہوا کرتی تھی۔ وہ جناب ملاّ احراروی تھے جو کالج کی لڑکیوں کو حرام کاری کا الزام دیتے اور شیخ عبداللہ کو گالیاں دیتے۔ ''کالج کی لڑکیاں حرام کاری کرتی ہیں۔'' جب میں نے یہ سنا کہ اس کمبخت نے ہم لوگوں کی انسلٹ کی ہے تو فوراً ایک مضمون لکھا اور اپنے پرنسپل صاحبہ کو دکھایا جس کی انھوں نے بڑی تعریف کی اور کہا کہ اس کو چھپنے کے لئے بھیجنا چاہئے۔ صحیح معنوں میں میری تخلیقی صلاحیت کا یہی پہلا نمونہ ہے جو ملاّ احراروی کے متعلق تھا۔ جب یہ مضمون چھپا تو ملا احراروی کا دفتر بند ہو گیا، اور شہر کے نوجوان لڑکوں نے اس کے دوسرے دن ہی دفتر میں گئے اور اس کو اس طرح کی باتیں اخبار میں چھاپنے کے لئے خوب سزا دی۔ ملا احراروی تو اس وقت نہیں تھے اس لئے دفتر کے تمام فرنیچر توڑ ڈالے۔ نہ جانے یہ نوجوان لڑکے کون تھے جنھیں اتنی ہمدردی تھی اور لڑکیوں کے ساتھ انصاف کیا۔ ہم سب لڑکیوں کو بہت خوشی ہوئی اور ہم سب نے ان نوجوان لڑکوں کو ایک دن حلوے بنا کر بھیجا اور اس کے بدلے میں ان لوگوں نے ہم سب کو مٹھائیاں بھیجیں۔ یہ کون تھے آج تک نہیں معلوم۔

علی گڑھ سے جب میں لکھنؤ کے کالج میں آئی تو وہاں بھی کھیل کود میں آگے رہی۔ ماشاءاللہ اس وقت تندرستی خوب تھی۔ ایک بار یونیورسٹی کے ایک طرف دو تین لڑکیاں ساتھ تھیں، ان کے ساتھ میں باتیں کرتی ہوئی جارہی تھی۔ اتنے میں ایک لڑکا آیا اور مجھے چنکوٹا اور میں زور سے چونکی پر میرا کیا تھا اس کو ایک زوردار گھونسا مارا اس کی سائیکل الگ گری اور وہ بے سدھ سڑک پر پڑا رہا، میری سہیلیاں پریشان کہ عصمت نے تو غضب کر دیا۔ ایک لڑکے

کو مارا اس کی شکایت میری نیچر تک پہنچی۔ ایک انگریز سٹرن تھی انھوں نے بلایا اور کہا لیکن میں اس سے بالکل نہیں ڈری۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تو اس کو پٹک دیتی، مجھے کمبخت نے چھیڑا تھا، مجھے ڈرامے کا رول دیا جاتا تھا، اس ڈرامے کے مکالمے بھی میں ہی لکھا کرتی تھی اور سب لڑکیاں ایکٹنگ کرتی تھیں۔ جب میرا رول آتا تھا تو مکالمہ کچھ ہوتا اور میں کچھ اور بول جاتی۔ تمام لڑکیاں ارے ارے کہتی رہتیں۔ میری ہی اسکرپٹ ہے اس لئے اپنی مرضی سے اسے تبدیل کیا کرتی تھی لڑکیاں بھناتیں اور کہتیں کہ سارا ڈراما عصمت نے تباہ کردیا۔ سوال اس کا نہیں کہ مکالمہ خراب ہوا بلکہ میری اپنی ضد تھی جس پر میں ہمیشہ اڑی رہتی۔ اس ضد نے تو بھائیوں اور بہنوں کو ایک دوسرے سے مرضی کی ہمت قائم رہی۔ زندگی بھر بھائیوں اور بہنوں سے لڑتی رہی، اسی لئے سب سے زیادہ تندرست تھی۔ مار پیٹ میں سب سے آگے، اس لئے کوئی ہو میں ڈرتی نہیں تھی اور آج بھی تنقید نگار کچھ بھی لکھیں مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔ میں کسی نقاد سے نہیں ڈرتی، چونکہ میں نے زندگی میں کوئی ایسا گناہ نہیں کیا، اس لئے میں کسی کا کوئی دباؤ اپنے اوپر قبول نہیں کرتی ہوں۔

جب میں قلم اٹھاتی ہوں تو خود بخود کاغذ پر چلنے لگتا ہے، وہ کیا صورت اختیار کرے اس کی مجھے کوئی پروا نہیں، اس کو پڑھنے والے یا تنقید نگار ہی فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ کیا بنا۔ میں تو قلم کا بوجھ اتارتی ہوں، قرض اتارتی ہوں اور بغیر سوچے سمجھے اس کو کیا نام دیا جائے گا یہ بعد کی بات ہے کچھ بھی نام دے سکتے ہیں اور دیا جاتا ہے اس کا کیا ہے جب کاغذ اکٹھا کیا تو عنوان دیا۔ جب میں لکھتی ہوں تو بس لکھتی ہی جاتی ہوں۔ جب زیادہ لمبا ہو جاتا ہے تو اس کو کم کرتی ہوں اور کچھ ڈائیلاگ وغیرہ اگر کم رہا تو اس کو بڑھایا اور کاٹ پیٹ کر ڈراما کی صورت دے دیا۔ مگر میں یقین سے کہتی ہوں اور خدا جانتا ہے کہ لکھنے کے بعد اصناف طے کرنا اور اس کو عنوان دینا فوراً ہی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو صبح بیٹھی اور شام تک لکھ ڈالی۔ جو چاہا نام دیا۔ ناول وغیرہ ایسی ہے کہ کوئی کوئی دو روز میں لکھی ہے۔ ''دل کی دنیا'' صرف دو ہی دن میں لکھی۔ لیکن ''معصومہ'' بھی اسی طرح کاغذ اٹھائی اور لکھنے بیٹھ گئی اور دو دن میں اسے مکمل کردی۔ ہاں سب سے زیادہ محنت میں نے ''ایک قطرہ خوں'' اور ''ٹیڑھی لکیر'' میں کی ہے۔ ان دونوں میں وقت بھی لگا اور ضخیم بھی ہو گئیں۔ لکھتے لکھتے جب تھکی تو رُک کر اس کا کلائمکس

لا دیا اور کتاب مکمل کر دیا۔

اشرف : آپ کو اپنی تخلیقات پر بہت انعامات ملے، گویا آپ کو قبول عام حاصل ہے۔ان انعامات پر آپ کا ردعمل کیا رہا ہے؟

عصمت چغتائی : بھئی میں تو کہتی ہوں کہ ایوارڈ کی کوئی اہمیت نہیں ہے اللہ کا دیا بہت کچھ ہے، لیکن اگر کوئی ایوارڈ دے دیتا ہے تو دے میری بلا سے میں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتی۔آج کل ایوارڈ لینے کے لئے ایوارڈ کمیٹی اور اس کے ممبروں کی خوب خوشامد کرتے ہیں۔چونکہ ان کی اپنی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔بس دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میں بڑا ہوں۔ اپنی خوب پبلسٹی کرتے پھرتے ہیں، آتا جاتا کچھ بھی نہیں اب ان کی وزیروں تک رسائی ہے فٹ سے ایوارڈ مل گیا۔میں تو کہتی ہوں ان کمبختوں کو ایوارڈ کی جگہ جوتا دینا چاہئے تاکہ زندگی بھر چاٹتے رہیں۔شرم نہیں آتی ایسوں کو جو ادب کو ایوارڈ کے لئے استعمال کرتے ہیں ان الو کے پٹھوں کو سرکار کی دلالی کرنے کے بجائے رنڈیوں کی دلالی کرتے تو شاید بہتر ہوتا اس لئے اس میں روپیہ ہی روپیہ ہے۔سرکار کا پٹھو بننا گویا رنڈی کی دلالی کرنا ایک ہی بات ہے۔میں نے تو کبھی کسی وزیر کی خوشامد نہیں کی اور نہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔میں قلم کی دلالی کرتی ہوں جس سے مجھے بہت کچھ ملتا ہے۔میں اسی میں خوش ہوں۔حیدر آباد سے مجھے دس ہزار کا ایوارڈ ملا، غالب اکادمی سے پانچ ہزار روپیہ کا روس سے پنڈت جواہر لال نہرو ایوارڈ اور مفت سیر کرنا جو میں سائیوریا کی یاترا کی اور پندرہ ہزار روپیہ کا نقد انعام اور ان کے علاوہ ملک کی طرف سے پدم شری کا ایوارڈ ملا جو صدر جمہوریہ کے دست مبارک سے حاصل کیا۔اس وقت کے صدر جمہوریہ فخر الدین احمد صاحب تھے۔ایوارڈ لینے جب گئی تو چار فٹ کے فاصلے سے مسز گاندھی کو دیکھا۔کیا خوبصورت عورت تھیں۔سب سے پہلے میری نظر مسز گاندھی پر پڑی،ان کا معصوم چہرہ میں دیکھتی رہی اور روشن آنکھوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ان کی مسکراہٹ بہت اچھی لگی،ان کے خوبصورت دانت بڑے ہموار اور چمکدار تھے۔ان کی جلد نوزائیدہ بچے کی طرح نازک اور قد مناسب مجھے بھئی بڑی پیاری لگیں۔ ان کی ایمرجنسی مجھے بہت پسند آئی۔خاص طور پر ۲۰ نکاتی پروگرام پر تو مجھے کوئی اعتراض نہیں اور جب میں نے سوچا کہ مجھے اپنے ملک کو خطرہ اور کوئی نقصان نہیں ہے۔بڑے اطمینان

سے میں انھیں ایک سچی ملک کی فرمانبردار عورت کی حیثیت سے دیکھتی رہی۔
مہاتما گاندھی کو پہلی بار دیکھ کر ملک کا مستقبل ان کے ہاتھوں میں محفوظ مانا۔ سورگیہ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو کے قبیلے کی لڑکی پر میں نے پورا بھروسہ کیا اور آج اسی مقام پر عوام نے راجیو گاندھی کو بٹھا دیا ہے۔
اس قلم کے بدولت جو مجھے پھٹکاریں ملی ہیں ان کی میں نے کبھی فکر نہیں کی۔ اور نہ ہی اس سے میری صحت پر کوئی اثر آیا۔ میں آج بھی ویسے ہی ہوں جیسی کل تھی۔ انعامات سے میری نظروں میں میری اپنی کوئی قیمت نہ بڑھی اور نہ گھٹی، اور نہ ہی اپنے پڑھنے والوں کی پسند اور ناپسند کا کوئی اثر نہیں رکھتی ہوں۔ آزاد ہوں آزاد رہوں گی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرا اگلا جنم کسی مہتر کی جھوپڑی میں ہوگا تاکہ اس کی جھاڑو پکڑ کر دنیا کے فٹ پاتھوں پر پھیر دوں گی، مجھے یقین ہے کہ میرا پچھلا جنم رانی لکشمی بائی جھانسی والی کا رہا اور عورتوں کی فوج میں کچھ ضرور رہی ہوں گی۔ شیواجی مہاراج پہلا سورما تھا جس نے ایک شہنشاہ پر حملہ کیا تھا۔ مغل بادشاہوں میں مجھے اکبر اور اورنگ زیب بہت پسند تھے۔
بہت دنوں سے ایک کہانی چکر لگا رہی تھی۔ اس وقت شمع زیدی بھی میرے گھر پر موجود تھی۔ کیونکہ اس کے بچے کو شدید بخار تھا۔ میں نے اس کو ایک کہانی کا آئیڈیا سنایا جو اسے اچھا لگا۔ میں نے اس کہانی کو تحریری شکل دے دیا اور ڈائیلاگ کیفی اعظمی نے لکھا۔ فلم کا نام "گرم ہوا" تھا۔ لیکن جناب مجھے کیا معلوم کہ فلم پٹ جائے گی۔ حالانکہ اس فلم کی کہانی لکھنے کا کوئی پیسہ نہیں ملا۔ لیکن یہ ہے کہ اس فلم پر جو ایوارڈ ملا وہ میمنٹ کی شکل میں تھا۔ اس فلم پر "راشٹرپتی پدک" ملا اور دس ہزار روپے جو میں نے اور کیفی نے آپس میں آدھا آدھا لیا اور اس کے علاوہ اس فلم کو "فلم فیئر" ایوارڈ بھی ملا وہ بھی آدھا آدھا آپس میں بانٹ لیا اور اس کے بعد میری فلم "سونے کی چڑیا" پر فلم جرنلسٹ کا ایوارڈ ملا۔ ایوارڈ اور پھٹکار میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔
کوئی تکلیف نہیں، کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ دونوں لڑکیاں ہیں ایک سیما ہے اور دوسری سبرینہ (منی) ہے سیما بڑی لڑکی ہے اس نے اپنی مرضی سے شادی کر لی ہے اور اب میرے پاس رہتی ہے۔ اس کا ایک بچہ بھی ہے جس کا نام آشیش ہے یعنی میرا نواسہ نے

میں بہت پیار کرتی ہوں۔ منی بھی کام کرتی ہے۔ یہ لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ ذمہ دار ہیں اور پورا گھر سنبھالتی ہیں۔ میں آرام کرتی ہوں۔ میرا نواسہ انٹرمیڈیٹ میں ہے۔ بہت ذہین ہے کئی بار اسے آنرل چکا ہے۔ اس کو ڈرامے کا شوق زیادہ ہے اور انگریزی کے علاوہ کوئی زبان اچھی طرح نہیں بولتا ہے۔ سوچتا ہے تو انگریزی میں لکھتا ہے تو انگریزی میں۔ میں نے اپنی لڑکیوں کو مکمل آزادی دے رکھی ہے۔ جس سے جی چاہے ملیں۔ مجھے اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ بڑی لڑکی کی طرح اگر چھوٹی والی بھی کسی سے اگر شادی اپنی مرضی سے کرلے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ دونوں میں ساڑھے چھ برس کا فرق ہے۔ بڑی لڑکی یعنی سیما کو اپنی چھوٹی بہن منی بہت عزیز ہے۔ اس لئے اس کو اپنی اولاد کی طرح مانتی ہے۔ سیما نے اس کو گود بچپن سے لیا ہے۔

شاہد کو کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ وہ صرف کلاسیکی کتابیں جمع کرتے تھے۔ یہی کتابیں دونوں لڑکیوں کا جہیز ہیں۔ زندگی بھر کتابیں اکٹھا کیں اور انتقال ہوگیا۔ میری بیٹیاں مجھے پالتی ہیں اور میں انھیں خوب لاڈ کرتی ہوں رمی کھیلنے کا شوق ہے۔ جو میں وقتاً فوقتاً کھیلا کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ روزانہ کچھ نہ کچھ لکھا بھی کرتی ہوں۔ گپیں مارتی ہوں۔ رسالہ پڑھتی ہوں، اخبار پڑھتی ہوں اور جو کچھ سامنے مل جاتا ہے اسے بغیر پڑھے نہیں چھوڑتی۔ پاکستان دو بار جا چکی ہوں۔ جہاں اپنے رشتہ دار اور دوست ہیں۔ لیکن یہ دوست رشتہ داروں سے کسی معنی میں کم نہیں۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ کی محبت اور پیار میں کوئی فرق نہیں۔ مجھے دونوں جگہ یکساں پیار و محبت ملا ہے۔ عزت، شہرت، دولت سب کچھ میرے پاس ہے۔ میں بہت خوش رہتی ہوں خدا کا دیا بہت کچھ ہے اور اس کی ذات سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے اور نہ رہے گی۔

اشرف : اردو زبان اور اس کے رسم خط کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟ اس کے مستقبل سے آپ مایوس ہیں؟

عصمت چغتائی : جب تک ہندوستان میں ایک مسلمان رہے گا۔ اردو پھلتی پھولتی رہے گی۔ مگر آجکل کے لئے تو روزی روٹی کی زبان انگریزی ہے۔ لیکن سبھی مسلمان انگریزی پڑھتے نہیں۔ بڑے لوگوں کے بچے انگریزی پڑھتے ہیں۔ لیکن غریب مسلمان تو اردو کا ہی

سہارا لیتا ہے ویسے تو بھی مسلمان قرآن ضرور پڑھے ہوتے ہیں۔ تھوڑا بہت بھی قرآن کی تعلیمات سے واقف ہوتے ہیں اور چاہئے کہ ہر مسلمان قرآن کو پڑھے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرے۔ کیونکہ اس میں انسانی زندگی کی بہت کچھ باتیں بتائی گئی ہیں۔ اس کی روشنی میں اگر مسلمان چاہے تو اپنی زندگی کو جنت بنا سکتا ہے۔ بڑا سکون ملتا ہے۔ میں تو کہوں گی اس سے اچھی کوئی اور کتاب نہیں۔ ہاں تو بات چل رہی تھی اردو کی کہاں چلی گئی میں۔ میں ذرا بوڑھی ہوگئی ہوں۔ دماغ میرے قابو میں اب نہیں رہتا۔

اردو کا رسم الخط اصل میں عربی میں ہے۔ اس لئے بڑی آسانی سے پڑھی جاتی ہے۔ ایسے ادیب اور شاعر ہیں جو باوجود غربت کے علم و ادب سے محروم نہیں۔ یہ اردو آسان اور سلجھی زبان کی طرح سمجھ میں آتی ہے۔ اس لئے اس کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔ ویسے اب دنیا کے مسلمان ادیب اور شاعر اپنے بچوں کو اردو کے بجائے انگریزی کانونٹ میں ڈالتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے بچے قرآن پڑھنے سے بھی دور رہتے ہیں۔ میری ہی لڑکیاں ہیں جو اردو تو اردو قرآن بھی نہیں پڑھا ہے۔ سردار، جاں نثار اختر، مجروح، کیفی یہ بھی اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دے رہے ہیں۔ اس لئے غریب آدمی اردو پڑھاتا ہے اور غریب آدمی ہندی بھی پڑھاتا ہے۔

ہندوستان سے اردو زبان کبھی نہیں مرے گی۔ ہمیشہ زندہ رہے گی صوبائی رنگ اختیار کر سکتی ہے۔ فلموں نے اردو کو عوام تک پہنچانے کا بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ صوبائی فلموں کو وہ شہرت نہیں ملی جو اردو فلموں کو ملتی ہے۔ فلم انڈسٹریز کی بنیاد مہاراشٹر میں پڑی۔ یہاں سے عظیم اداکار اور ہٹ فلمیں پورے ہندوستان میں کامیاب ہوئیں۔

صوبہ پرستی نے مہاراشٹر اور بنگال کے فلموں کے بازار محدود کر دیا اور ان کا معیار بھی گر گیا اور پورے ہندوستان سے ہر دل عزیزی بھی ختم ہوگئی ایک وہ وقت تھا جب درگا کھوٹے، لیلا چٹنس، سوم ناتھ وغیرہ ہندوستانی فلموں میں چھائی ہوئی تھیں۔ مہاراشٹر فلموں اور بنگالی فلموں میں اپنے ملک اور اس کی تہذیب کو اجاگر کیا اور آج ان کے دائرے محدود ہوگئے۔ مہاراشٹر بنگال، گجرات، پنجاب یہ سب اب مکمل ہندوستان نہیں رہے یعنی آج ہندوستان کو ہندوستانیوں نے صوبہ پرستی کا رنگ دے کر ہندوستان کو ذہنی طور پر تقسیم کر دیا

ہے۔انگریز نے ہندوستان کو دوحصوں میں تقسیم کیا۔ خود ہندوستانی رہنماؤں نے چودہ ٹکڑے کردیے اور حال ہی میں اس کے اور بھی ٹکڑے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں ابھی کتنے ٹکڑے ہوں گے۔

اشرف : اب ایک سوال اور جنسیات کے سلسلے میں آپ کے خیالات کافی بدنام ہیں۔آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

عصمت چغتائی : اگر ایک انسان کپڑے، زیور، ساز و سامان سے خوش ہو جاتا ہے تو پھر شادی کی کیا ضرورت ہے۔انسان کی تخلیق سیکس سے ہوتی ہے ورنہ خدا اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔سیکس تو ذرے ذرے میں ہے۔ پیڑوں میں ہے، پودوں میں ہے، جانوروں میں ہے،لیکن حیوانات اور نباتات اس کو پیشہ نہیں بناتے۔ پیشہ تو انسان بناتا ہے اور اس کا گندا استعمال کر کے سب کے لئے سردرد کرتے ہیں۔سیکس کے گندے استعمال سے گھٹن، غیر فطری افعال کا راستہ کھلتا ہے۔

ہمارے ملک میں سیکس کی توپوجا ہوتی ہے...... یہاں سیکس تو بڑی مقدس چیز ہے۔ سیکس کوئی گندی چیز نہیں۔سیکس سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔سیکس تو زندگی کی اہم ترین ضرورت ہے۔

''لحاف'' میں بیگم کی ضرورت زندگی پوری نہیں ہوئی تو وہ زندہ رہنے کے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہیں، جو غیر فطری ہوتا ہے۔اس میں یہ تو تعریف نہیں کی کہ یہ فعل بہت مقدس ہے۔صرف لحاف اٹھنا، دیواروں پر ہاتھی کا سایہ ابھرنا اور اس سے اس بچی کا خوف زدہ ہونا کیا یہ سیکس ہے۔جنس کا قطعی کوئی پہلو نہیں ہے۔ بھئی میں پوچھتی ہوں کہ اس لحاف میں کیا ہے؟ جس سے گندگی محسوس ہو رہی ہے۔تنقید نگاروں نے الزام لگایا، مقدمہ چلا، دو ایک پیشی ہوئی، مگر بغیر کسی جرمانہ سزا کے آزاد ہوگئی۔مخالف وکیل نے کہا کہ اس میں گندگی ہے۔سیکس ہے۔میں نے اس سے کہا کہ اس گندگی کو منہ پر لاؤ، آخر اس لحاف میں کیا ہو رہا ہے کہ وہ منہ پر کیوں نہیں لاتے۔الفاظ گندے ہیں۔یا یہ ہاتھی کا سایہ جو اٹھتا ہے وہ گندا ہے۔بھئی میں کہتی ہوں جو سیکس ہے اسے منہ پر لاؤ جس سے دماغ میں گندگی ہے۔احساس ہے۔کہیں لکھا تو نہیں ہے اور اس طرح مخالف وکیل کی ایسی کی تیسی ہوگئی۔''لحاف'' میں

ISMAT CHUGHTAI
KI
GHAIR AFSANVI NIGARISHAT

by

Dr. Mohd. Ashraf

ڈاکٹر محمد اشرف نے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لیے "اردو فکشن کے ارتقا میں عصمت چغتائی کا حصہ" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا اور اس کی اچھی پذیرائی ہوئی۔ اس سے حوصلہ پاکر انھوں نے عصمت کی دیگر اصناف کی نگارشات کی طرف توجہ مبذول کی اور انھیں اپنی تحقیق و تنقید کا موضوع بنایا۔ ان کی یہ کاوش اس کتاب کی شکل میں آپ کے پیشِ نظر ہے۔

اس کتاب کے لیے مواد کی فراہمی میں اشرف نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے کام لیا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے دیگر اصناف کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی سعی مشکور کی ہے کہ یہ نگارشات بھی ان کے ناولوں اور افسانوں سے ندرتِ فکر، جرأتِ اظہار اور انفرادیتِ اسلوب میں کسی طرح کم نہیں۔ انٹرویو بھی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ عصمت چغتائی نے اس انٹرویو میں اپنی حیات، شخصیت اور اپنے فکر و فن پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

پروفیسر احمر لاری

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com